الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

اگر لوگ کل کے امید افزا حالات کو جانیں
تو وہ کبھی
آج کے مایوس کن حالات پر دل شکستہ نہ ہوں

فروری ۱۹۹۰ شمارہ ۱۵۹

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ
جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۹ فروری ۱۹۹۰

فہرست

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333. 611128

مثبت اثر

مشہور نحوی سیبویہ (م ۱۷۷ھ) ایران میں پیدا ہوا اور بصرہ میں پرورش پائی۔ اس کی نوجوانی کا واقعہ ہے جب کہ وہ حدیث و فقہ کا طالب علم تھا۔ ایک دن وہ حماد بن سلمہ کی مجلس میں تھا۔ انھوں نے ایک حدیث کا املا کراتے ہوئے کہا: لیس من اصحابی احد الا لو شئت لاتخذت علیہ، لیس ابا الدرداء سیبویہ یہ سن کر بول اٹھا: لیس ابو الدرداء۔ اس پر حماد نے چلا کر کہا: سیبویہ تم غلطی پر ہو۔ یہ استثناء ہے (اس لیے ابو کے بجائے ابا ہے) سیبویہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ میری نحو کمزور ہے اور مجھے اس میں مہارت پیدا کرنی چاہیے۔ اب اس نے نحو سیکھنا شروع کر دیا۔

وہ بصرہ و کوفہ کے نحوی علماء خلیل، یونس اور عیسی بن عمر کی مجلسوں میں جانے لگا۔ اس نے اس فن میں اتنی محنت کی کہ بالآخر وہ اس کا امام بن گیا۔ نحو و ادب کے شاذ مسائل میں اس کا کوئی ثانی نہ رہا۔ اس کے بعد اس نے نحو پر ایک ایسی کتاب لکھی جو اپنی اہمیت اور بلندی کی وجہ سے "الکتاب" کے نام سے مشہور ہے۔ اس فن کے علماء کا کہنا ہے کہ فن نحو پر اس کے برابر کی کوئی کتاب آج تک لکھی نہ جا سکی ـــــ جس شخص کی نحو کمزور تھی، وہ تاریخ کا سب سے بڑا نحوی بن گیا۔

ہر شخص کی زندگی میں ایسے واقعات آتے ہیں جب کہ اسے ٹھیس لگتی ہے۔ جب اس کو دوسروں کی طرف سے بے اعترافی کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان بے جگہ ہو گیا ہے۔

ایسے مواقع پر اثر لینے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی ان تجربات کے بعد بے ہمتی اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔ ایسے آدمی نے گویا اپنے آپ اپنے کو مار لیا۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کے لیے ایسا تجربہ ایک مہمیز بن جائے۔ ایسے آدمی کے لیے اس کا تجربہ اس کی صلاحیتوں کو جگانے کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ از سر نو محنت اور عمل کے رخ پر چل پڑتا ہے، یہاں تک کہ ماضی کا ناکام انسان مستقبل کا کامیاب انسان بن جاتا ہے۔ مثبت تاثر آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور منفی تاثر ناکامی اور بربادی کی طرف۔

اسلام کی برکت

منگولیا کے پہاڑی علاقہ میں بسنے والے قبائل کے سردار کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے بعد کو چنگیز خاں (۱۲۲۷-۱۱۶۳) کے نام سے شہرت پائی۔ وہ نہایت لائق اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ اس نے وحشی قبائل کو متحد کر کے ایک فوج بنائی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے لیے مقدر کیا گیا ہے کہ وہ سارے عالم کو فتح کرے۔

اولاً چنگیز خاں اور اس کے بعد اس کے بیٹے اور پوتے عالمی فتح کے اس منصوبہ کے لیے نکل پڑے۔ یہ لوگ جو تاریخ میں تاتاری یا منگول (Mongols) کہے جاتے ہیں، انھوں نے مشرقی یورپ سے لے کر چین اور ہندستان تک آباد دنیا کے بڑے حصہ میں تباہی برپا کر دی۔ ۱۲۲۰ میں وہ ترکستان میں داخل ہوئے۔ ایک وسیع علاقہ میں انھوں نے عمارتیں ڈھا دیں، شہریوں کو قتل کر ڈالا۔ آبپاشی کے نظام کو تہ و بالا کر دیا (18/793) ۱۲۵۸ میں انھوں نے بغداد کے عالیشان شہر کو کھنڈر بنا ڈالا (2/586) وغیرہ، وغیرہ۔

ان وحشی قبائل کی یہ تباہ کاری مشرقی یورپ تک پہونچ گئی تھی۔ انھوں نے ۴۲-۱۲۴۱ میں پولینڈ پر حملہ کیا۔ انھوں نے روتھینیا (Red Ruthenia) کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ یہاں سے وہ پولینڈ پر غارت گرانہ حملہ کرتے تھے۔ ان مسلسل حملوں نے پولینڈ کو تباہ و برباد کر دیا تھا:

... from this base their repeated raids devastated Poland (14/639).

ان منگولوں (تاتاریوں) کی تباہ کاری کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے وحشت و بربریت کے اس طوفان سے دنیا کو نجات دی۔ یہ صرف اسلام کی تسخیری طاقت تھی۔ ۱۲۵۸ میں جب وہ مسلم دنیا میں فاتح بن کر داخل ہوئے تو اسلام نے ان کے قلب و روح کو مسخر کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ تقریباً نصف صدی کے اندر مسلم قوموں کو بھی ان کے ظلم سے نجات مل گئی اور اسی کے ساتھ بقیہ دنیا کو بھی ——— آج دوبارہ دنیا کے انسان اس انتظار میں ہیں کہ اسلام وقت کے "تاتاریوں" کی روح کو مسخر کرے اور انسانی سماج دوبارہ امن اور انصاف کا گہوارہ بن جائے۔

صبر و برداشت

حضرت ابو سعید سعد بن مالک بن سنان الخُدری کی ایک روایت ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے اپنی "صحیح" میں نقل کیا ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو اللہ کی طرف سے صبر سے زیادہ بہتر اور زیادہ بڑا عطیہ نہیں دیا گیا۔ (وما اُعطیَ اَحدٌ عطاءً خیراً واوسعَ مِنَ الصّبر)

صبر تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔ خواہ اس کا تعلق دنیا کی کامیابی سے ہو یا آخرت کی کامیابی سے۔ پیغمبر اسلامؐ کی یہ تعلیم اعلیٰ ترین فطری صداقت تھی۔ چنانچہ وہ ساری دنیا میں مختلف شکلوں میں دہرائی گئی۔ شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۲۱۳) نے اس کو فارسی زبان میں اس طرح بیان کیا کہ صبر کڑوا ہے، مگر اس کا پھل میٹھا ہے:

صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

اس کے بعد زندگی کا یہ قیمتی سبق عالمی ادب میں پہونچا اور ہر ملک میں اس کو کسی نہ کسی صورت سے نقل کیا گیا۔ مثلاً فرانسیسی مفکر روسو (۱۷۷۸ - ۱۷۱۲) نے یہی بات دوبارہ اس طرح کہی کہ برداشت کڑوی چیز ہے مگر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے:

Patience is bitter, but its fruit is sweet.

صبر کا کڑواپن چند منٹ کے لیے ہوتا ہے، مگر بے صبری کے نتیجہ میں جو کڑواپن آتا ہے وہ برسوں تک بھی ختم نہیں ہوتا۔ صبر کا جھٹکا ذہن کے اندر صرف نفسیاتی طور پر سہنا پڑتا ہے، مگر بے صبری وہ چیز ہے جو آخر کار جانوں کو ہلاک کرتی ہے۔ جائدادوں کو برباد کرتی ہے۔ وہ آدمی کو آگ اور خون کے دریا میں پہونچا دیتی ہے۔

صبر ایک اصول ہے جب کہ بے صبری صرف ایک منفی ردّ عمل ہے۔ صبر کرنے والا اپنے آپ کو بااصول انسان ثابت کرتا ہے۔ اس کو اندرونی طور پر اطمینان کی یہ لذت ملتی ہے کہ وہ کٹھن گھڑیوں میں بھی اصول پر قائم رہا۔ اس کے برعکس بے صبر انسان کے حصہ میں یہ بدنصیبی آتی ہے کہ وہ وقتی طور پر بھڑک کر ایک جذباتی کارروائی کرے، اور پھر ساری عمر پچھتاتا رہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

روشن پہلو

مدراس میں ۶۰ ویلیج روڈ پر ایک مسجد بنائی گئی ہے۔ یہ مسجد مسلم ویلفیر اسوسی ایشن کے زیر انتظام ہے۔ اس مسجد پر اذان کے لیے لاوڈ اسپیکر لگایا گیا تو علاقہ کے کچھ ہندوؤں کو اس پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے پولیس سے شکایت کی کہ لاوڈ اسپیکر پر اذان سے ہمارے گھروں اور ہمارے مندروں کے سکون میں خلل واقع ہوتا ہے، اس لیے مسلمانوں کو لاوڈ اسپیکر پر اذان دینے سے روکا جائے۔ مگر مدراس پولیس نے اس شکایت پر کوئی کارروائی نہیں کی۔

اس کے بعد ایک مقامی ہندو نے مدراس ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن داخل کیا۔ اور عدالت سے درخواست کی کہ لاوڈ اسپیکر کی اذان مقامی ہندوؤں کے لیے تکلیف (Nuisance) کا باعث ہے، اس لیے اس کو بند کرنے کا حکم جاری کیا جائے۔

جسٹس بکھاوت سولم نے دونوں فریقوں کے بیانات سننے کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ کو اپنا فیصلہ سنایا۔ انھوں نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں عدالت کو مداخلت کرنی چاہیے۔ مدعی کے دلائل میری نظر میں تشفی بخش نہیں ہیں۔ ایک جمہوری ملک میں ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرے۔ اس طرح کے معاملات میں ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر تحمل اور رواداری (Tolerance) ہو، خاص طور پر ہندستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب پر عمل کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ مدعی کی درخواست قابل لحاظ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسجد میں لاوڈ اسپیکر کا استعمال عین قانون کے مطابق ہے۔ اس اظہار خیال کے ساتھ مدعی کی درخواست خارج کی جاتی ہے:

With these observations, the writ petition will stand dismissed.

مدراس ہائی کورٹ کا فیصلہ مکمل اور اصلی صورت میں الرسالہ انگریزی (دسمبر ۱۹۸۹) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ فیصلہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں اگر کچھ لوگ متعصب اور فرقہ پرست ہیں تو یہاں ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو بے تعصب اور انصاف پسند ہیں۔ مزید یہ کہ یہ دوسرے لوگ اس حد تک طاقت ور ہیں کہ وہ پہلے گروہ کے ارادے کو عمل میں آنے سے روک دیں۔

مومن کا طریقہ

ابوالبرکات علوی صاحب (پیدائش ۱۹۲۹) اعظم گڈھ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ نومبر ۱۹۴۶ میں دیوبند گیے تھے۔ وہاں وہ چند روز مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷-۱۸۷۹) کے مہمان رہے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ کانگریسی مسلمانوں اور مسلم لیگ کے لوگوں کے درمیان اختلاف اپنے آخری عروج پر تھا۔ مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے پر جوش مسلمان مولانا حسین احمد مدنی کے سخت ترین مخالف تھے۔ مولانا مدنی کے خلاف جھوٹے الزام لگانا، ان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرنا، ان کے دینی وقار کو مجروح کرنا، غرض ان کے خلاف ہر نازیبا حرکت کو انھوں نے اپنے لیے جائز کر لیا تھا۔

نفرت اور اشتعال کی یہی فضا تھی جب کہ ابوالبرکات علوی نے دیوبند کا سفر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز جب کہ وہ مولانا مدنی کے مہمان خانہ میں تھے۔ مولانا اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک شخص آیا۔ بظاہر وہ مولانا مدنی کے مریدوں میں سے تھا۔ اس نے کہا: مولانا، قائدِ اعظم مسٹر جناح کا اللہ کے یہاں کیا حشر ہوگا۔

ابوالبرکات علوی کا بیان ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی یہ سوال سن کر کچھ دیر چپ رہے۔ اس کے بعد سنجیدہ انداز میں فرمایا: اگر اس کے ارادے نیک ہیں تو اس کا اجر بھی نیک ہوگا۔ اور اگر اس کے ارادے نیک نہیں ہیں تو اس کا اجر بھی نیک نہیں ہوگا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ سخت ترین شکایت اور اختلاف کی حالت میں بھی مومن کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ مومن اللہ سے ڈرنے والا انسان ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اس کے ہر قول اور فعل کا اس سے حساب لینے والا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک حد پر قائم رہے، وہ ہر حال میں انصاف کی بات کہے۔

مولانا حسین احمد مدنی مسٹر جناح کے سخت مخالف تھے۔ دونوں کے درمیان تعلقات اشتعال انگیزی کی حد تک خراب ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جب مولانا کو مسٹر جناح کے بارہ میں بولنا ہوا تو وہ جدیت کے دائرہ میں رہ کر بولے۔ اپنے قابل نفرت دشمن کے بارہ میں بھی وہ انصاف کی حد سے باہر نہ جا سکے۔

ایک سُنّت

مکہ کی فتح (۸ ھ) کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے طائف کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

ثم سلك في طريق يقال لها الضيقة۔ فلما توجه فيها رسول الله صلى الله عليه وسلم سأل عن اسمها۔ فقال: ما اسم هذه الطريق۔ فقيل له الضيقة۔ فقال بل هي اليسرى۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۲۷)

پھر آپ اس راستہ میں چلے جس کو ضیقہ (تنگ) کہا جاتا تھا۔ جب آپ نے اس کا رُخ کیا تو آپ نے اس کا نام پوچھا اور کہا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے۔ آپ کو بتایا گیا کہ ضیقہ (تنگ)۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ وہ یُسریٰ (آسان) ہے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم و تربیت کا طریقہ کیا تھا۔ وہ آدمی کے طرزِ فکر کو بدلنا تھا۔ لوگ جس چیز کو "مشکل" کے روپ میں دیکھ رہے ہوں، اس کے متعلق ایسی نظر پیدا کرنا کہ وہ اس کو "آسانی" کے روپ میں دیکھنے لگیں۔ آج ضرورت ہے کہ پیغمبر کی اس سنّت کو زندہ کیا جائے۔ لوگوں کے سوچنے کے طریقہ کو بدلنا اور ان کے ذہن کو درست کرنا یہی آج کرنے کا سب سے بڑا کام ہے۔ اسی کام کے کرنے پر ملّتِ مسلمہ کے مستقبل کا انحصار ہے۔

موجودہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کو قومی ہیرو کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اس کے بجائے ان کے اندر یہ ذہن بنانا کہ پیغمبر ایک قابلِ تقلید اسوہ ہے۔ آج مسلمان اپنی تاریخ سے فخر کی غذا لے رہے ہیں۔ اس کے بجائے انھیں تاریخ سے سبق لینے والا بنانا۔ مسلمان اپنے مسائل کو ظلم کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، اس کے بجائے ان کو اس قابل بنانا کہ وہ انھیں چیلنج کی نظر سے دیکھیں۔ مسلمان دوسری قوموں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھے ہوئے ہیں، اس کے بجائے ان کے اندر یہ نگاہ پیدا کرنا کہ وہ دوسری قوموں کو مدعو کی حیثیت دیں اور ان کے ساتھ داعیانہ اخلاق والا معاملہ کریں۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے اندر ایسا فکری انقلاب لانا کہ وہ موجودہ قومی نگاہ کو چھوڑ دیں اور چیزوں کو ربانی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ آج سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس چھوڑی ہوئی سنّت کو مسلمانوں میں دوبارہ زندہ کیا جائے۔

بہتر حل

۲ اکتوبر ۱۹۸۹ کو تامل ناڈو کے حکیم محمد صفدر شریف (۵۴ سال) سے ملاقات ہوئی :

H.M. Safdar Shareef, 26, Nadeemullah Makkan Street, Salem-636001

انھوں نے سیلم پور کے ایک قصبہ تمم پٹی (Tammampatti) کا ایک واقعہ بتایا۔ یہاں کی آبادی ۱۰ ہزار ہے جس میں تقریباً ۵ فی صد مسلمان بستے ہیں۔ تمم پٹی میں ۲۶ فروری ۱۹۸۹ کو ہندوؤں کا ایک مذہبی جلوس نکلا۔ یہ جلوس ایک مندر سے شروع ہو کر ایسی سڑک سے گزرنے والا تھا جس پر ایک مسجد واقع ہے۔ مسلمانوں کو اس روٹ پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جلوس میں باجا اور شور ہوگا۔ اس سے ہماری عبادت میں خلل پیدا ہوگا۔

اس موقع پر ایک ہیڈ کانسٹبل مسلمانوں سے ملا۔ اس نے کہا کہ فریق ثانی کی طرف سے ان کو برہم کرنے کی پوری تیاری ہے۔ مگر اس کا حل یہ ہے کہ آپ لوگ بالکل خاموشی اختیار کریں۔ ہرگز کوئی مداخلت نہ کریں۔ اس کے بعد پولس اپنے آپ ان سے نپٹ لے گی۔

مسلمانوں نے اس مشورہ کو مان لیا۔ انھوں نے مقررہ وقت پر مسجد میں اندر سے تالا لگایا اور نمازیوں سے کہہ دیا کہ آپ چپ چاپ اپنی نماز ادا کریں۔ جلوس وہاں رات کو عشار کی نماز کے وقت پہونچا۔ وہ لوگ باجا بجاتے ہوئے اور نعرہ لگاتے ہوئے مسجد والی سڑک پر پہونچے۔ مسجد میں ان کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر مسلمانوں نے کوئی روک ٹوک نہ کی۔ اس وقت پولس سامنے آئی۔ اس نے جلوس والوں سے کہا کہ تم لوگ مسجد کے سامنے باجا نہ بجاؤ۔ اور چپ چاپ یہاں سے گزر جاؤ۔ مگر وہ لوگ نہیں مانے۔ پولس نے پہلے آنسو گیس چھوڑا۔ مگر مجمع بہت بڑا تھا، قابو میں نہ آیا۔ اس کے بعد پولس نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے نتیجہ میں کئی لوگ زخمی ہوئے اور دو ہندو نوجوان مر گیے۔ اب جلوس منتشر ہوگیا۔

ایسے تمام مواقع پر یہی مسئلہ کا واحد حل ہے۔ ان مواقع پر مسلمان جب خود مداخلت کی کوشش کرتے ہیں تو مسئلہ ہندو۔ مسلم بن جاتا ہے۔ مسلمان اگر خاموش رہیں تو مسئلہ ہندو۔ پولیس رہے گا، اور پھر پولیس زیادہ بہتر طور پر وہ کام کر دے گی جس کو مسلمان صرف ناقص طور پر کرنا چاہتے ہیں۔

بے خبری

اقبال کا ایک مشہور فارسی شعر ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ کا دین آدمی کو غار میں اور پہاڑی ویرانوں میں لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا دین اسلام ہم کو جنگ وشکوہ کا سبق دیتا ہے:

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ

مصلحت در دینِ ما جنگ وشکوہ

اقبال کا یہ شعر بتاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے، کم ازکم شعوری طور پر، بالکل بے خبر تھے۔ اقبال ۱۸۷۷ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۸ میں ان کی وفات ہوئی۔ یہ پورا زمانہ وہ ہے جب کہ "عیسیٰ" کو ماننے والی قوموں نے صدیوں کی ترقیاتی کوششوں کے بعد اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھایا کہ وہ تقریباً پوری دنیا پر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر غالب آگئیں۔ بالفاظِ دیگر، انھوں نے دینِ اسلام کے پیرؤوں کو "غار وکوہ" میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اور خود "جنگ وشکوہ" کے ہر میدان میں مکمل برتری حاصل کر لی۔

اس واضح واقعہ کے باوجود اقبال اپنا مذکورہ بالا شعر کہتے ہیں جو اصل صورت حال کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر ماضی سے بھی بے خبری کا ثبوت ہے اور حال سے بے خبری کا بھی۔

مسیحی لوگ ابتدائی زمانہ میں اپنے مخالفین کی دار وگیر سے بھاگ کر غاروں اور پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ غالب قوم بن گئے۔ یہی واقعہ خود مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ کے ابتدائی دور میں مسلمان اپنے دین کو لے کر پہاڑی گھاٹیوں میں چلے گئے، اور ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد حالات بدلے اور مسلمان عالمی سطح پر غالب اور فاتح بن گئے۔

اقبال اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دورِ ثانی کو جانتے ہیں اور مسیحیوں کے صرف دورِ اوّل کو۔ ایسے بے خبر لوگ اگر اپنی قوم کو وقت کے مطابق صحیح رہنمائی نہ دے سکیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

اس قسم کی رہنمائی صرف جھوٹا فخر دے سکتی ہے، مگر جھوٹا فخر کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

خدمت کا کرشمہ

ریڈرس ڈائجسٹ (جون ۱۹۸۹) میں ایک چونکا دینے والی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کو مرتب کرنے والے ایک ہندستانی جرنلسٹ مسٹر اشوک مہادیون ہیں۔ وہ ہندستان سے کراچی گئے اور وہاں قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد اپنی مفصل رپورٹ مرتب کی جو مذکورہ ریڈرس ڈائجسٹ میں شائع ہوئی ہے۔

یہ کراچی کے ایک شخص کی کہانی ہے۔ اس کا نام عبدالستار ایدھی ہے۔ اس نے اپنی ۴۰ سالہ خدمات کے نتیجہ میں اپنے ماحول کے اندر غیر معمولی عزت اور گرویدگی حاصل کی ہے۔ مسٹر مہادیون کے الفاظ میں، کراچی کے مجرم لوگ بھی ان کی عزت اور احترام کرتے ہیں۔ ایک بار ان کو معلوم ہوا کہ کراچی کے مضافات میں پولیس اور ڈاکوؤں کے گروہ کے درمیان گولی چل رہی ہے۔ وہ فوراً ایک ایمبولنس لے کر مقام واردات کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیسے ہی وہ وہاں پہونچے، ڈاکوؤں نے ان کو دیکھ کر فائرنگ روک دی۔ ایدھی اس میں کامیاب ہوگئے کہ وہ ایک سب انسپکٹر کی لاش کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں رکھ سکیں۔ ڈاکو اس دوران بے تابی کے ساتھ ایدھی کے جانے کا انتظار کرتے رہے اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں واپس جانے کے لیے کہتے رہے۔ جیسے ہی وہ وہاں سے روانہ ہوئے، ڈاکوؤں نے دوبارہ پولیس کے اوپر فائرنگ شروع کردی:

Such feelings are shared even by Karachi's criminals. Once, hearing that the police and a gang of dacoits were engaged in a shoot-out in a city suburb, Edhi drove to the scene in an ambulance. As soon as he arrived, the dacoits stopped firing, and Edhi was able to carry the body of a dead-inspector into his vehicle. The dacoits then impatiently waved Edhi away, and as he left, began shooting at the police again (pp. 116-17).

ایک شخص کو یہ درجہ کیسے ملا کہ اس کو دیکھ کر ڈاکو بھی اپنی بندوقیں نیچی کرلیں۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ اس کا نام عبدالستار ہے۔ اور نہ اس کا سبب احتجاج اور مطالبہ یا جلسہ اور تقریر کے ہنگامے تھے۔ اس کا سبب صرف ایک تھا، اور وہ انسانی خدمت ہے۔ عبدالستار نے اپنے ۴۰ سالہ بے لوث خدمت سے یہ مقام پیدا کیا کہ ڈاکو بھی اس کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جائیں۔

عبدالستار ایدھی (عمر ۵۵ سال) ایک پاکستانی مہاجر ہیں۔ ۱۹۴۷ میں وہ گجرات کو چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ ابتداءً انھوں نے کپڑے اور دوا کی دکان پر ملازمت کی۔ ان پر کئی ایسے تجربے گزرے جب کہ ایک مریض یا حادثہ کا شکار آدمی کو اسپتال پہونچانے کے لیے فوری طور پر ایمبولنس کار کی ضرورت تھی۔ مگر وقت پر ایمبولنس نہ پہونچنے کی وجہ سے آدمی تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ان کے دل میں آیا کہ وہ ایمبولنس سروس کا ایک رفاہی ادارہ قائم کریں گے۔

۱۹۵۰ میں انھوں نے عطیات کی رقم سے ایک سکنڈ ہینڈ ٹرک خریدا اور اس کو ایک معمولی قسم کے ایمبولنس میں تبدیل کر کے مریضوں اور زخمیوں کی خدمت شروع کی۔ یہ کام بڑھا۔ یہاں تک کہ اب ان کے پاس ۲۴۵ ایمبولنس کا دستہ ہے۔ وہ کراچی کے اندر اور کراچی کے باہر غریبوں اور معذوروں کی مفت خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کا سماجی خدمت کا ادارہ ہر روز ہزاروں پاکستانیوں کی خدمت کرتا ہے۔ ایمبولنس کے دستہ کے علاوہ ان کے تحت زچہ خانے، بلڈ بینک، اکسرے کلنک، لیبارٹری، نرسنگ اسکول، یتیم خانے، معذور خانے وغیرہ چل رہے ہیں۔ انھوں نے ایتھوپیا (۵۳ ہزار ڈالر) فلسطین (۶۶ ہزار ڈالر) بنگلہ دیش (۱۰ ہزار ڈالر) اور اسی طرح بعض دوسرے ملکوں کے مصیبت زدگان کی خدمت کی ہے۔ اب وہ ایر ایمبولنس سروس اور دوسرے بڑے بڑے ادارے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً جدید طرز کا اسپتال، حیوانات کا اسپتال وغیرہ۔

ان کا سالانہ بجٹ تقریباً ۱۰ کرور روپیہ ہے۔ اور یہ سب عوامی چندوں سے حاصل ہوتا ہے۔ سابق صدر ضیاء الحق نے ایک بار انھیں پانچ لاکھ روپیہ کا چیک بھیجا۔ مگر عبدالستار ایدھی نے اس کو واپس کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کام عوام کے لیے ہے اور عوام ہی کو اس کی قیمت دینا چاہیے۔ وہ نہایت سادہ طور پر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے اوپر اتنا زیادہ اعتماد ہے کہ بغیر طلب انھیں بڑی بڑی رقم دیتے رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں یقین ہے جو رقم ان کو دی جائے گی وہ ضرور صحیح طور پر استعمال ہوگی۔

۱۹۸۶ میں ان کو خدمتِ خلق (Public Service) کے لیے (Ramon Magsaysay Award) دیا گیا ہے۔ عبدالستار ایدھی اس سے پہلے ایک مقامی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس انعام نے انھیں بین اقوامی حیثیت دیدی۔ اس طرح وہ انسانی خدمت کی اس ممتاز فہرست میں آگئے جس میں اب تک

صرف مدر ٹریسا کو شہرت حاصل تھی۔ اگرچہ مدر ٹریسا کا کام بہت بڑا ہے۔ ان کو نوبیل انعام بھی مل چکا ہے۔ تاہم عبدالستار ایدھی غالباً مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس میدان میں نمایاں خدمت کا ایسا ثبوت دیا ہے کہ عالمی سطح پر ان کا اعتراف کیا گیا۔

اس طرح کا کام پیشہ ورانہ طور پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے خدا کی خلقت سے گہری شفقت کا تعلق ہونا ضروری ہے۔ اور یہ چیز مدر ٹریسا اور عبدالستار ایدھی میں مشترک ہے۔ مدر ٹریسا کا کہنا ہے کہ میں ہر انسان کے اندر خدا کو دیکھتی ہوں:

I see God in every human being.

یہی معاملہ عبدالستار ایدھی کا ہے۔ چنانچہ مسٹر اشوک مہادیون کے ایک سوال کے جواب میں عبدالستار ایدھی نے کہا کہ میں ان کے اندر خدا کو دیکھتا ہوں:

I see God in them (p. 119).

خدمت کی برکت

انسان کی خدمت کا معاوضہ انسان کی محبت ہے۔ یہ اصول کسی ایک ملک کے لیے نہیں ہے، بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے۔ جو لوگ انسانوں کی خدمت کریں، ان کو اس سے ایک طرف بے پناہ قلبی سکون ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسروں کے اندر انھیں عزت اور محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ ان کے دشمن بھی ان کے دوست بن جائیں۔ خطرناک ڈاکو بھی ان کو دیکھ کر اپنے ہتھیاروں کا استعمال ترک کر دیں۔

تعمیر ما سیاست

ابوعلی محمد بن علی بن مقلہ (۳۲۸ــ ۲۷۲ھ) نہایت اعلیٰ صلاحیت والا آدمی تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی فن کارانہ صلاحیت سے قدیم عربی خط (خط کوفی) میں مجتہدانہ اصلاحات کیں۔ اور اس کو حسین اور جامع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے عربی خط کو ابتدائی دور سے نکال کر تکمیلی دور میں پہنچا دیا۔ فلپ کے ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربس میں اس کو عربی فن کتابت کا بانی (Founder of Arabic Calligraphy) کہا ہے (صفحہ ۴۶۸)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے کہ ابن مقلہ ۸۸۶ء میں بغداد میں پیدا ہوا، اور ۹۴۰ء میں بغداد ہی میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ عباسی دور (۷۵۰ــ ۱۲۵۸) کا ممتاز ترین خطاط تھا۔ اس نے عربی خط کو کوفی خط کے دور سے نکال کر نسخی خط کے دور میں پہنچایا۔ اس طرح اس نے عربی خط کو نیا حسن (Beauty) عطا کیا۔ (V/272)

ابن مقلہ ابتداءً بغداد میں عباسی حکومت کے ایک دفتر میں چھ دینار ماہوار پر منشی تھا۔ پھر اس کا فنی کمال اس کو خلیفہ کے دربار تک لے گیا۔ یہاں اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مسلسل تین بادشاہوں کا وزیر بنتا رہا۔ اولاً مقتدر باللہ عباسی (۳۲۰ــ ۲۸۲ھ) کا، پھر اس کے بھائی قاہر باللہ (۳۲۲ــ ھ) کا، اس کے بعد راضی باللہ (۳۲۹ــ ۲۹۷ھ) کا۔

واضح ہو کہ "وزیر" قدیم زمانے میں وزیر اعظم کے ہم معنی ہوتا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کا صرف ایک وزیر ہوتا تھا اور اس کو سارے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ مقتدر باللہ کے ابتدائی زمانے میں حامد بن عباس وزیر تھا۔ اس کے ساتھ اس نے علی بن عیسیٰ الجراح کو نائب وزیر بنایا تو لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ ایک شاعر کی نظم کا ایک شعر یہ ہے :

اعجب من کل ما رأینا ان وزیرین فی بلاد

سب سے عجیب بات جو ہم نے دیکھی وہ یہ کہ ایک ملک میں دو وزیر ہیں

ابن مقلہ کے یہ مناصب اس کے فن کی ترقی میں بے حد مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اگر ان ملے ہوئے مواقع کو وہ فن تحریر اور اس سلسلے کی دوسری چیزوں کی ترقی اور تحقیق میں لگاتا تو نہ صرف یہ کہ عربی رسم الخط

بہت پہلے اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تحریر اور کتاب کے میدان کی بہت سی دوسری ایجادیں جو اس کے بہت بعد سامنے آئیں اسی کے زمانے میں وجود میں آگئی ہوتیں۔

مثال کے طور پر کاغذ ابن مقلہ سے آٹھ سو برس پہلے ۱۰۵ء میں چین میں ایجاد ہوا۔ اس کا ایجاد کرنے والا سائی لون تھا جو ابن مقلہ کی طرح چینی شہنشاہ ہوتی کا وزیر تھا۔ روسی ترکستان میں عربوں اور چینیوں کی جنگ میں کچھ چینی قیدی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ کاغذ بنانا جانتے تھے۔ سمرقند میں ان سے کاغذ بنوایا گیا۔ اس کے بعد ۷۹۵ء میں دستی کاغذ کی صنعت بغداد میں قائم ہوئی۔ تاہم مشین کے ذریعے کاغذ بنانے کا کام پہلی بار ۱۷۵۰ء میں ہالینڈ میں کیا گیا۔ مسلسل رول کی شکل میں کاغذ بنانے کی صنعت ۱۷۹۸ء میں فرانس میں شروع ہوئی۔

اسی طرح پرنٹنگ پریس پہلی بار غالباً چینیوں نے ۷۷۰ء میں دریافت کیا۔ یہ ابن مقلہ (۹۴۰—۸۸۵ء) کی پیدائش سے ۱۱۵ سال پہلے کا زمانہ تھا۔ پرنٹنگ کا قدیم ترین نمونہ اس سے بھی پہلے پانچویں صدی عیسوی کا چین میں دریافت ہوا ہے۔ یورپ میں ترقی یافتہ پرنٹنگ پریس ۱۵ ویں صدی میں گوٹن برگ نے بنایا اور بائبل چھاپی۔ تاہم مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس نپولین کے ذریعے ۱۷۹۸ میں پہلی بار مصر پہنچا۔

ابن مقلہ جو نہ صرف فن تحریر کا ماہر تھا بلکہ حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو اپنے میدان میں لگاتا تو کاغذ اور چھپائی اور اس طرح کی دوسری نعمتیں جو عالم اسلام کو بہت بعد کو ملیں، شاید ابن مقلہ کے زمانہ ہی میں وہ اس کو مل چکی ہوتیں۔ ابن مقلہ ہزار سال پہلے دنیا کو دور پریس میں داخل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر وہ اس پر قانع نہ رہ سکا کہ اپنے آپ کو اپنے مخصوص میدان میں محدود رکھے۔ وزارت کے ملے ہوئے مواقع کو وہ تحریر اور کاغذ اور چھپائی کی ترقی میں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ان مواقع کو عزت و ناموری کی طرف چھلانگ لگانے کے لیے ایک زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ خود بھی برباد ہوا، اور ملت بھی اس قیمتی فائدہ سے محروم رہ گئی جو اس کی خداداد صلاحیت کے ذریعہ ملت کو پہنچ سکتا تھا۔

ابن مقلہ جب وزیر (یا وزیر اعظم) کے منصب پر پہنچ گیا تو اس کے لیے صحیح ترین بات یہ تھی کہ وہ اس اعلیٰ موقع کو تعمیری میدان میں استعمال کرے۔ مگر وہ حب جاہ کی اسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو گیا جس میں اکثر وہ لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں جن کو حالات کسی بلند مقام پر پہنچا دیں۔ اس کے فنی اور تعمیری حوصلے اب سیاسی

عزائم میں تبدیل ہوگئے۔ خاموش خدمت میں مشغول رہنے کے بجائے اب وہ خفیہ قسم کی سیاسی اور فوجی تحریکوں کا لیڈر بن گیا۔ اب اس نے چاہا کہ حکومت کے نظام میں اپنے مفید مطلب انقلاب لائے۔ اس نے ایک خفیہ منصوبہ کے تحت یہ کوشش شروع کر دی کہ خلیفہ قاہر باللہ کو تخت سے اتار کر ابو احمد بن مکتفی کو عباسی سلطنت کا تاج پہنایا جائے۔

کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبک الشیٔ یُعمی و یُصم) ابن مقلہ بھی اپنی ساری ذہانت کے باوجود اسی کمزوری کا شکار ہوا۔ وہ اپنے حالات کا اور اس کے مقابلہ میں خلیفہ کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ چنانچہ راز کھل گیا۔ ابن مقلہ پر یہ الزام لگا کہ اس نے فوجی سردار مونس خادم کے ساتھ مل کر قاہر باللہ کی حکومت کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔

سازش کے انکشاف کے بعد ابن مقلہ کا گھر جلوا دیا گیا۔ ابو احمد بن مکتفی کو دیوار میں چن دیا گیا۔ تاہم ابن مقلہ کی ذہانت اس کے کام آئی۔ وہ فرار ہو کر بچ گیا اور اس کے بعد پانچ لاکھ دینار خلیفہ کو نذر کر کے دوبارہ وزارت حاصل کر لی۔ مگر اس کے سیاسی عزائم نے دوبارہ اس کے لیے مسائل پیدا کئے۔ یہاں تک کہ راضی باللہ نے اس کو وزارت سے معزول کر کے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا۔ بلاشبہ یہ ایک سخت ترین سزا تھی جو کسی فن کار کو دی جا سکتی تھی۔ گھر کی قید میں جو اشعار وہ پڑھا کرتا تھا، اس میں سے ایک شعر یہ تھا:

لیس بعد الیمین لذۃ عیش　　　یا حیاتی بانت یمینی فبینی

دایاں ہاتھ کٹ جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں، اے میری زندگی جب میرا دایاں ہاتھ مجھ سے جدا ہو گیا تو تو بھی جدا ہو جا۔

ابن مقلہ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ سے بھی وہ اتنا ہی اچھا لکھ لیتا تھا جیسا وہ دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ میں ایک قلم باندھا اور اس سے لکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ہاتھ کٹنے سے پہلے کے خط اور ہاتھ کٹنے کے بعد کے خط میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باکمال انسان اپنے گھر کے قید خانے میں ۵۶ سال کی عمر میں مر گیا۔ (ہٹی، صفحہ ۴۲۴)

ابن مقلہ شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ماتم میں بہت سے اشعار موزوں کیے۔ وہ کہتا تھا:

وہ ہاتھ جس نے قرآن کے فلاں فلاں نسخے لکھے، جس نے رسول اللہؐ کی فلاں فلاں حدیثوں کی کتابت کی، جس نے مشرق اور مغرب میں احکام لکھ کر بھیجے، وہ چوروں کے ہاتھ کی طرح کاٹ دیا گیا۔

مگر اس دنیا میں اس قسم کے جذباتی الفاظ کی کوئی قیمت نہیں۔ ابن مقلہ کی غلطی یہ تھی کہ وہ قرآن اور حدیث لکھنے ہی پر نہیں رکا، اس نے حد سے نکل کر ایسے مقام پر اپنا ہاتھ ڈال دیا جو اس کا مقام نہ تھا۔ اور جو شخص اس طرح حد سے نکل جائے، اس کا اس دنیا میں یہی انجام ہوتا ہے۔

ابن مقلہ مر گیا مگر اس کا کردار آج بھی زندہ ہے۔ آج بھی بہت سے لوگ ہیں جو عین ابن مقلہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ وہ اپنے ملے ہوئے مواقع کو تعمیر ملت کی بجائے ذاتی جاہ کو حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ملت کی تاریخ تعمیر کی تاریخ بننے کے بجائے تخریب کی تاریخ بن رہی ہے۔

ماضی کے ابن مقلہ کو تاریخ معاف کر سکتی ہے، مگر حال کے "ابن مقلہ" جو اپنے مناصب کو تعمیری جدوجہد میں نہیں لگاتے بلکہ اشتہاری قسم کے ذاتی عزائم میں اپنے قیمتی مواقع کو برباد کر رہے ہیں، ان کے پاس دوسری بار اس اندوہناک غلطی میں مبتلا ہونے کا کیا عذر ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا (المومن لا یلدغ من جحر مرتین)

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہترین صلاحیتیں ہمیشہ سیاسی عزائم میں برباد ہوئی ہیں۔ سیاست بازی کے کام میں عام طور پر وہی لوگ حصہ لیتے ہیں جو قدرت سے اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیت کو کسی تعمیری خدمت میں لگانے کے بجائے سیاسی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ بے شمار اقتصادی وسائل برباد ہوتے ہیں۔ اور عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ کچھ لوگوں کو لیڈرانہ شہرت حاصل ہو جائے اور عوام کے حصہ میں صرف یہ نتیجہ آئے کہ ایک "ظالم" کی جگہ دوسرا "ظالم" تخت سلطنت پر بیٹھ گیا ہو۔

تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے کہ مقابلہ آرائی کی سیاست سے کبھی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہوا ہو۔ قوم کو اٹھانے کا راز یہ ہے کہ قوم کے رہنما اپنے سیاسی جھنڈے کو نیچا کر لیں۔ انفرادی حوصلوں کا "بیج" جہاں زمین میں دفن ہوتا ہے وہیں سے قومی مستقبل کا شاندار "درخت" اگتا ہے۔ آج ہماری تاریخ کو اسی قسم کی نفسیاتی شہادت کا انتظار ہے نہ کہ جسمانی قتل اور ہلاکت کا۔

طاقت کا خزانہ

انسانی دماغ ایک ناقابل یقین نظام ہے۔ اس کی جسامت ایک سنگترہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ مگر وہ ایک سکنڈ میں ۸۰۰ یاد داشتیں ریکارڈ کر لیتا ہے۔ وہ اوسطاً ۷۵ سال تک برابر یہ کام جاری رکھ سکتا ہے۔

انسانی دماغ میں جو بات بھی پڑتی ہے، وہ پوری طرح اس کو محفوظ کر لیتا ہے، اور پھر کبھی اس کے کسی جزء کو فراموش نہیں کرتا۔ خواہ ہم ان تمام معلومات کو شعوری طور پر یاد میں نہ لا سکیں۔ تاہم ہمارے دماغ کے مستقل فائل میں ہر چیز ہر وقت موجود رہتی ہے۔

اگر ایک ایسا کمپوٹر بنایا جائے جس کے امکانات انسانی دماغ کے برابر ہوں تو اس کا انفراسٹرکچر اتنا زیادہ ہوگا کہ وہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ جیسی عمارت کو گھیر لے گا۔ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ نیویارک میں ہے۔ اس کی ۱۰۲ منزلیں ہیں اور اس کی اونچائی ۱۲۵۰ فٹ ہے۔ ایسا سپر کمپوٹر اگر بنایا جا سکے تو اس کو چلانے کے لیے ایک ارب واٹ بجلی کی توانائی درکار ہوگی۔ اس کی لاگت اتنی زیادہ ہوگی جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے :

The brain is a fabulous mechanism. About the size of half a grapefruit, it can record 800 memories a second for the average 75 years many of us live, without exhausting itself. The human brain retains everything it takes in and never forgets anything. Even though we don't recall all the information received, everything is on permanent file in our brain. If a computer to match the brain's potential was built, it would occupy space comparable to the size of the Empire State Building (1,250 feet tall) and need 1,000,000,000 watts of electrical power to run. The cost would be equally immense. The mind is one of God's most amazing gifts to man. Yet most people use only a small fraction of their mental ability. For many, the power remains largely untapped.

The Plain Truth, October 1988, p. 29.

یہ دماغ انسان کے لیے اللہ کا ایک انتہائی حیرت ناک تحفہ ہے۔ تاہم بڑے سے بڑا سائنس داں بھی اس کو صرف جزئی طور پر استعمال کر پاتا ہے۔ دماغ کے تمام اعلیٰ امکانات ابھی تک غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

امریکی میگزین اسپان (Span) کے شمارہ ستمبر ۱۹۸۹ میں ایک تحقیقی مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ——— ہمارا حیرت ناک دماغ :

Our wondrous Brain

اس مضمون کے مرتب یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ کے سینیر اڈیٹر مسٹر ولیم ایف آل مین (William F. Allman) ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دماغی تحقیق کا کام موجودہ زمانہ میں اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب اس کی ایک علیحدہ علمی شاخ وجود میں آچکی ہے جس کو دماغ کی سائنس (Brain science) کہا جاتا ہے۔ اس سائنس کے تحت جو بے شمار نئی معلومات سامنے آئی ہیں وہ ایک قسم کے انفجار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک سائنس داں نے دماغ کو فکری انجن (Engine of thought) سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ یہ تعبیر بے حد ناقص ہے۔ کیونکہ دماغ کے ایک لاکھ ملین نیوران (100,000 million neurons) جس طرح متحدہ طور پر کام کرتے ہیں، اور ایک لمحہ کے اندر اشیاء کے مابین تمیز کر لیتے ہیں، وہ کوئی بڑی سے بڑی امکانی مشین بھی نہیں کر سکتی۔ اپنی حیرت ناک کارکردگی کے اعتبار سے ایک فرد واحد کا دماغ دنیا کی تمام مشینوں اور تمام کمپیوٹروں پر بھاری ہے :

An explosion of recent findings in brain science — aided by new computer programs that can simulate brain cells in action — is now revealing that the brain is far more intricate than any mechanical device imaginable (p. 24).

اس سلسلہ میں جدید تحقیقات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اگرچہ بیسویں صدی کے سائنس دانوں نے اس بات کی کافی کوشش کی کہ وہ ایسی مشینیں بنائیں جو انسانی دماغ جیسا کام کر سکیں۔ مگر انتہائی طاقتور قسم کا سپر کمپیوٹر بھی ابھی تک انسانی دماغ سے بہت پیچھے ہے :

Though 20th-century scientists have tried to make machines that mimic the brain's functioning, even the most powerful supercomputer falls far short of the real thing (p. 28).

انسانی دماغ طاقت کا اتھاہ خزانہ ہے۔ یہ خزانہ ہر آدمی کو پیدائشی طور پر حاصل ہے۔ وہ کسب اور

کوشش کے بغیر ہر آدمی کو اپنے آپ ملا ہوا ہے۔ دماغ کے ہوتے ہوئے کوئی بھی شخص مفلس نہیں، کوئی بھی شخص دوسروں سے کمزور نہیں، خواہ ظاہری سامان کے اعتبار سے وہ کتنا ہی زیادہ مفلس اور کمزور دکھائی دیتا ہو۔

دماغ کی صورت میں سب سے زیادہ طاقت ور مشین آپ کے پاس موجود ہے، ایسی مشین جس کے مثل کوئی دوسری چیز ساری معلوم کائنات میں کہیں موجود نہیں۔ اس طاقت ور مشینی خزانہ کو استعمال کیجئے، اس کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو بر روئے کار لانے کی کوشش کیجئے۔ اور پھر کبھی آپ کو ناکامیابی کی شکایت نہ ہوگی۔

دنیا میں کسی بھی شخص نے جو بھی ترقی یا کامیابی حاصل کی ہے، وہ اسی دماغ کی طاقت کو استعمال کرکے حاصل کی ہے۔ فطرت کی دی ہوئی یہی عظیم طاقت آپ کے پاس بھی موجود ہے۔ امکانی طور پر آپ بھی عین اسی ترقی کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں جہاں کوئی بھی شخص کبھی پہنچا ہے۔ پھر مایوسی کیوں اور شکایت کس لیے۔ اپنے امکان کو واقعہ بنائیے۔ کامیابی کی ہر بلندی اس انتظار میں ہے کہ آپ وہاں پہنچیں اور اپنے آپ کو اس کے اوپر کھڑا کر دیں۔

نفرت، محبت

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کی مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کے اصحاب بھی وہاں موجود تھے۔ اتنے میں ایک اعرابی (دیہاتی گنوار) وہاں آیا۔ وہ مسجد کے اندر ایک جگہ کھڑا ہوکر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ اس کو پکڑنے اور مارنے کے لیے دوڑے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کہ اسے چھوڑ دو۔ جب اعرابی پیشاب کر چکا تو آپ نے صحابہ سے کہا کہ ایک بالٹی پانی لاؤ اور جہاں اس نے پیشاب کیا ہے وہاں پانی بہا کر اس کو صاف کر دو۔ اس کے بعد آپ نے اعرابی کو بلایا اور نرمی کے ساتھ اس سے کہا کہ دیکھو یہ مسجد ہے۔ یہاں خدا کا ذکر اور عبادت کی جاتی ہے۔ یہ بول و براز کرنے کی جگہ نہیں۔

اعرابی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا۔ ابتدا میں اگر اس کا گنوار پن جاگا ہوا تھا تو اب اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ وہ اسی حالت میں اپنے قبیلہ میں واپس گیا۔ وہاں وہ دیوانہ وار لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ دیکھو، میں مدینہ گیا۔ وہاں میں نے یہ گندا کام کیا کہ محمد کی مسجد میں پیشاب کر دیا۔ مگر انھوں نے صرف یہ کیا کہ جہاں میں نے گندا کیا تھا اس کو پانی سے دھو دیا۔ خدا کی قسم محمد نے نہ مجھ کو جھڑکا اور نہ وہ میرے اوپر غصہ ہوئے (واللہ ما زجرنی محمد، واللہ ما قہرنی محمد) اعرابی کا یہ کہنا اس کے قبیلہ والوں کے لیے اسلام کی تبلیغ بن گیا۔ چنانچہ پورا کا پورا قبیلہ اسلام کے دین میں داخل ہو گیا۔ جس قبیلہ کے ایک آدمی نے مسجد میں آکر پیشاب کر دیا تھا، اسی قبیلہ کے تمام آدمی دوبارہ مسجد میں اس لیے آئے کہ مسجد کا احترام کریں اور اس میں ایک خدا کے آگے سجدہ کر کے اپنی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کریں۔

یہ دور رسالت کا واقعہ ہے۔ اب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ ۱۸۳۱ میں سید احمد شہید بریلوی کو زبانی طور پر یہ خبر ملی کہ پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کی کچھ مسجدوں کو اصطبل بنا دیا ہے۔ وہاں اس کے گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ اس خبر کے بعد انھیں کسی مزید تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بہت سے مسلمانوں کو لے کر پنجاب پہونچے اور رنجیت سنگھ کی فوجوں سے لڑ گئے۔ اس لڑائی میں ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ ایک تذکرہ نگار کے الفاظ میں، پنجاب کی زمین مسلمانوں کے

خون سے لالہ زار ہو گئی۔

۱۸۵۷ کے غدر (یا جنگ آزادی) میں یہ واقعہ ہوا کہ مسلمان اس بات پر بھڑک اٹھے کہ انھیں وقت کے حکمرانوں کی طرف سے ایسے کارتوس دیئے گئے ہیں جن میں خنزیر کی چربی لگی ہوئی ہے۔ یا کچھ انگریز سپاہی اپنے گھوڑوں پر چڑھ کر کسی مسجد کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے انگریزوں سے جو لڑائی لڑی، اس میں لاکھوں مسلمان مارے گئے۔ بے شمار مسلمانوں کا خون بہا۔ مگر سب کچھ لاحاصل، کیوں کہ جو صورت حال تھی، وہ بدستور مزید شدت کے ساتھ برقرار رہی۔

اس وقت سے لے کر اب تک لڑائی بھڑائی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ مسلمان ہر طرف اپنا خون بہا رہے ہیں۔ غیر قوم کا کوئی شخص مسجد کی دیوار پر رنگ ڈال دے۔ کوئی مسجد کے سامنے غلط نعرے لگا دے۔ کوئی جلوس باجا بجاتا ہوا مسجد کی سڑک سے گزر جائے۔ اس طرح کا کوئی واقعہ ہو تو مسلمان مشتعل ہو کر لڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان فساد ہوتا ہے گولیاں چلتی ہیں۔ بے شمار لوگ مارے جاتے ہیں۔ اس طرح کے جھگڑے اور لڑائیوں میں مسلمانوں کا جو خون بہتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کو ناپنے کے لیے بالٹی کی نہیں بلکہ ڈرم کی ضرورت ہوگی۔ مسلمانوں کے اپنے بیان کے مطابق سڑکوں پر مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ بستیاں مسلمانوں کے خون سے سرخ ہو رہی ہیں۔

اب دیکھیے کہ یہ سارا خون جو بہایا جا رہا ہے اس کا فائدہ کیا ہے۔ کیا اس کی وجہ سے خدا کے بندے خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے اسلام کے دشمن اسلام کے دوست بن رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے کہ قومیں اور قبیلے اسلام میں داخل ہو کر اسلام کی طاقت بن جائیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں کے خون کا سیلاب ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت سے بہہ رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص نہیں جس کی روح کو خون کے اس دریا نے پاک کیا ہو۔ کوئی ایک آدمی نہیں جو اس خون کی وجہ سے مسلمانوں کے دین میں داخل ہوا ہو۔ کوئی ایک قبیلہ نہیں جس نے مسلمانوں کے اس عمل کو دیکھ کر ایسا کیا ہو کہ وہ خدا کی نافرمانی کو چھوڑ کر خدا کا مومن و مسلم بن جائے

یہ فرق کیوں ہے۔ دور رسالت میں پانی نے جو نتیجہ دکھایا تھا، بعد کے دور میں خون بھی وہ نتیجہ

نہ دکھا سکا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا پانی محبت کا پانی تھا۔ اور موجودہ مسلمانوں کا خون نفرت کا خون ہے۔ رسول نے انسان کے اوپر معافی، خیر خواہی، شفقت اور مہربانی کی بارش برسائی تھی۔ اس کے برعکس آج کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ انسان کے اوپر نفرت اور غصہ اور اشتعال کا خون انڈیل رہے ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دورِ اول کے عمل کا یہ نتیجہ پیدا کیا تھا کہ قومیں کی قومیں اور قبیلے کے قبیلے اسلام کے سایہ میں داخل ہو گیے۔ اسلام ساری دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ غالب دین بن گیا۔ اور موجودہ زمانہ میں اسلام ساری دنیا میں حقیر ہو رہا ہے، وہ ایک بلین مسلمانوں کے باوجود ساری دنیا میں کمزور اور مغلوب مذہب بنا ہوا ہے۔

ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر دو مختلف صلاحیتیں ہیں۔ ایک نفس لوامہ (ضمیر) اور دوسرے، نفسِ امّارہ (انانیت)۔ یہ دونوں صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہیں۔ اب اگر آپ فریق ثانی کے نفسِ لوامہ کو جگائیں تو اس کی شخصیت کا انسانی جزء آپ کے حصہ میں آئے گا۔ اور اگر آپ فریق ثانی کے نفسِ امارہ کو جگائیں تو اس کی شخصیت کا حیوانی جزء آپ کے حصہ میں آئے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ آپ آدمی کے وجود کے انسانی حصہ کو جگائیں۔ اس لیے آپ نہ صرف اچھوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے بلکہ بروں کے ساتھ بھی آپ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے آدمی کی چھپی ہوئی فطرت جاگتی تھی۔ اور آخر کار وہ اسلام قبول کر کے آپ کا ساتھی بن جاتا تھا۔

موجودہ مسلمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل نہیں کرتے کہ بروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ وہ ہمیشہ ردّعمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا طریقہ صرف فریق ثانی کی انانیت کو جگانے کا باعث بنتا ہے۔ خدا کے بندوں کے لیے ان کے پاس "محبت کا پانی" نہیں، البتہ ان کے پاس "نفرت کا خون" کافی مقدار میں موجود ہے۔ جس کو وہ لوگوں کے اوپر انڈیلتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا کے اس باغ میں صرف کانٹے ملیں گے۔ وہ اس باغ کے پھولوں کے مالک نہیں بن سکتے۔ یہی قانونِ قدرت کا فیصلہ ہے۔

اسلام کی اثر انگیزی

شیخ محمد بدر الاسلام فضلی بی اے ، بی ٹی (علیگ) ہندستان سے جاپان گیے ۔ انگریزی دور کی ہندستانی حکومت نے ان کا تقرر ٹوکیو کے اسکول آف فارن لینگویجز میں کیا تھا ۔ وہ وہاں اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے ۔

مسٹر فضلی دسمبر ۱۹۳۰ میں سمندری جہاز سے جاپان پہونچے ۔ وہ اپریل ۱۹۳۲ تک وہاں مقیم رہے ۔ جاپان کے حالات اور اپنے سفر کی روداد پر انھوں نے اسی زمانہ میں ایک کتاب "سیاحت جاپان" لکھی تھی ۔ یہ کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۳۴ میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے شائع ہوئی تھی ۔ مطبع کا نام کتاب پر "جامع برقی پریس دہلی" لکھا ہوا ہے ۔

مصنف نے اس کتاب میں جو واقعات نقل کیے ہیں ، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ انسائیکلو پیڈیا میں اسلام پر مقالہ لکھنے کے لیے ایک جاپانی فاضل نے اسلام کا مطالعہ کیا ۔ اس سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ۔ یہاں ان کے اپنے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں :

" جمعہ کے روز نماز کے لیے مسجد گیا ۔ ۵۰ نمازی جمع ہوتے ۔ ہر شخص ہیٹ کے نیچے ایک گول مخمل کی ٹوپی پہن کر آیا تھا ۔ نیچے کی منزل میں اور زینہ پر بہت سی کھونٹیاں دیوار پر لگی ہوئی ہیں ۔ ہیٹ ان پر ٹانگ دی اور گول ٹوپی پہن کر اوپر کے ہال میں جہاں نماز ہوتی ہے ، جمع ہوتے ۔ بعض لوگوں نے نیچے کی منزل میں وضو بھی کیا ۔

نماز کے بعد تمام نمازیوں سے مصافحہ ہوا ۔ یہیں ایک جاپانی صاحب سے بھی تعارف ہوا ۔ یہ بھی نماز میں شریک تھے ۔ ایک روسی مسلمان مسٹر صابر جمیل نے مجھ کو اور جاپانی مسلمان صاحب کو جن کا نام مسٹر سبورو تھا ۔ اسی وقت چائے نوشی کی دعوت دی ۔ صابر صاحب مسجد کے قریب ہی ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں رہتے ہیں ۔ ان کی اہلیہ محترمہ عائشہ نے مہمانوں کی بڑی خاطر مدارات کی ۔

مسٹر سبورو سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی ۔ میں نے دریافت کیا کہ اسلام کی کس خوبی نے آپ کو اس طرف مائل کیا ۔ انھوں نے بیان کیا کہ ان سے جاپانی انسائیکلو پیڈیا میں اسلام کے متعلق آرٹیکل لکھنے کے لیے کہا گیا تھا ۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ۔ مطالعہ اور تحقیق کے بعد

خود بخود اسلام کی حقانیت ان پر روشن ہو گئی۔ اور بغیر کسی خارجی تحریک کے مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کی بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر دو خوبیوں نے خصوصاً ان پر بڑا اثر کیا۔ اول توحید اور ثانیاً مذہبی رواداری۔ مسٹر سبورو ٹوکیو میں تنہا جاپانی مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ تمام جاپان میں معدودے چند جاپانی مسلمان ہیں۔ سیاحت جاپان، صفحہ ۱۴ - ۱۱۱

ماضی اور حال کی تاریخ میں اس طرح کے واقعات کثرت سے پائے جاتے ہیں جب کہ کسی آدمی نے اتفاقاً کسی اور مقصد کے تحت اسلام کی کتابوں کو پڑھا۔ پڑھنے سے پہلے وہ سمجھتا تھا کہ وہ صرف معلومات کے لیے اسلام کو پڑھ رہا ہے۔ مگر جب اس نے اسلام کو پڑھا تو وہ اس سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کامل معنوں میں ایک فطری مذہب ہے۔ انسان کی فطرت میں جو احساسات غیر ملفوظ حالت میں چھپے ہوئے ہیں، اسلام انھیں احساسات کو ملفوظ حالت میں بیان کرتا ہے۔ اسلام ہر آدمی کے اپنے دل کی آواز ہے۔

چنانچہ جب کوئی شخص اسلام کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اپنے دل کی کتاب کو پڑھ رہا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ جس اسلام کو اس نے صرف پڑھا تھا، اس کو وہ عملاً بھی اختیار کر لے۔ اسلام کو جان لینے کے بعد اس کو نہ ماننا خود اپنا انکار بن جاتا ہے، اور کون ہے جو خود اپنا انکار کرنے کا تحمل کر سکے۔

رحمۃ للعالمین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں رحمۃ للعالمین (سارے عالم کے لئے رحمت) کہا گیا ہے۔ اسی بات کو خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں اس طرح نظم کیا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

پیغمبر اسلام رحمت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ ایک مورخ کے الفاظ میں، رحمت آپ کی شخصیت کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ آپ کا تمام قول اور تمام عمل جس بنیادی اصول کے ماتحت ہوتا تھا وہ یہی رحمت کا پہلو ہے۔ آپ وہی بات بولتے تھے جس میں انسانوں کے لئے رحمت کا سامان ہو۔ آپ اسی طریقہ کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کرتے تھے جو انسانی معاشرہ میں رحمت والا نتیجہ پیدا کرے۔

آپ جس دین کو لائے اس کی بابت قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ اس دین کے ذریعہ لوگوں کو سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اسی لئے آپ کے لائے ہوئے دین کا نام اسلام قرار پایا جس میں سلامتی کا مفہوم شامل ہے۔ آپ مکمل سلامتی تھے اور آپ نے لوگوں کو سلامتی کی طرف دعوت دی۔

آپ نے انسان کو جس جنت کا طالب بننے کی دعوت دی، اس کی تصویر قرآن میں یہ ہے کہ اس میں کوئی لغو بات یا گناہ کی بات نہ ہوگی۔ وہاں ہر طرف صرف سلامتی کا قول سنائی دے گا۔ اس طرح آپ نے لوگوں کو بتایا کہ اگر تم موت کے بعد والی دنیا میں جنت کے ماحول میں رہنا چاہتے ہو تو موت سے پہلے کی زندگی میں تم کو لغو باتوں اور گناہ والے کاموں سے بچنا ہوگا۔ تم کو دنیا کے لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تمہارے دل میں لوگوں کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر تم نے اپنے بارہ میں اس اخلاقی صفت کا حامل ہونے کا ثبوت نہیں دیا تو تم جنت کی نفیس آبادیوں میں بسائے جانے کے لئے نااہل ٹھہرو گے۔

آپ نے انسان کو یہ تعلیم دی کہ جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملے تو وہ اس سے کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ (تمہارے اوپر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو) یہ صرف ایک لفظی کلمہ نہیں، بلکہ یہ دوسرے کے بارہ میں اپنے دل کی کیفیت کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ تمہارے لئے میرے دل میں صرف سلامتی کا جذبہ ہے۔ میں تمہارا اتنا زیادہ خیر خواہ ہوں کہ

میرے دل سے تمھارے لئے امن و عافیت کی دعائیں نکلتی ہیں۔ مجھ سے تم کوئی اندیشہ محسوس نہ کرو، بلکہ میری طرف سے مامون رہو۔ کیوں کہ مجھ سے تم کو سلامتی اور رحمت کے سوا کوئی اور تجربہ ہونے والا نہیں۔

آپ نے لوگوں کو تلقین کی کہ ہر شخص دوسرے کے لئے نفع بخش بننے کی کوشش کرے، اگر وہ نفع بخش نہ بن سکے تو وہ اس کے حق میں اچھی بات کہے۔ اگر یہ بھی اس کے بس میں نہ ہو تو وہ کم از کم یہ کرے کہ وہ اپنے شر سے دوسروں کو بچالے۔ آپ نے راستہ سے پتھر یا کانٹا ہٹانے کو بھی ایمان کا جزء قرار دیا۔

آپ نے اپنے پیروؤں کے لئے جو عبادتی احکام مقرر کئے، ان میں سے ایک زکاۃ ہے۔ زکاۃ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کمائی کا ایک حصہ ہر سال دوسرے حاجت مندوں کو دیا جائے۔ یہ گویا مال کے ذریعہ اس بات کی تصدیق کرنا ہے کہ میں سنجیدگی کی حد تک دوسروں کا خیر خواہ ہوں۔

انسانی اخلاقیات کی بنیاد آپ نے جس اصول پر رکھی وہ یہ تھا کہ —— دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ یہ اصول پوری سماجی زندگی کے لئے رحمت ہے۔ ہر آدمی کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ اس کو کیا چیز پسند ہے اور کیا چیز ناپسند۔ مثلاً ہر آدمی چاہتا ہے کہ مجھ سے محبت کی جائے، مجھ سے نفرت نہ کی جائے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ امانت داری کا معاملہ کیا جائے، اس کے ساتھ دغا بازی کا معاملہ نہ کیا جائے۔ ہر آدمی کو پسند ہے کہ لوگ اس سے میٹھا بول بولیں، کڑوا بول نہ بولیں۔

بس پسند اور ناپسند کا یہی معاملہ ہر آدمی دوسروں کے ساتھ بھی کرنے لگے۔ اگر ہر آدمی ایسا کرے کہ دوسروں کے ساتھ وہ وہی سلوک کرے جو سلوک وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے تو سارا سماج امن اور سلامتی کا گہوارہ بن جائے۔

آپ نے لوگوں کو جن باتوں کی تعلیم دی، ان میں سے ایک اہم تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے، تب بھی تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ تم لوگوں کے ساتھ برابر کا اخلاق نہ برتو بلکہ برتر اخلاق کا طریقہ اختیار کرو۔ دوسروں کے ساتھ تمہارا برتاؤ ان کے عمل کے ردعمل میں نہ ہو، بلکہ خود اپنے اعلیٰ اصولوں کی روشنی میں ہو۔

اس تعلیم میں بہت بڑی حکمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی کا یہی واحد راز

ہے۔یہاں دوسروں کی طرف سے بدی کا تجربہ پیش آنے کے باوجود ان کے ساتھ نیک سلوک کرنا پڑتا ہے۔جو لوگ "باوجود" کے اس اصول کو نہ مانیں وہ اس دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکتے، وہ کبھی اس اعلیٰ اخلاقی رویہ پر قائم نہیں رہ سکتے، جس کا انھوں نے اپنی زبان سے اقرار کیا تھا۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں ہر آدمی آزاد ہے۔ہر آدمی کو کھلا موقع حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ اس دنیا میں ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمام لوگ ایک جیسے ہوجائیں۔ ایسی یکسانیت پتھر کے بنے ہوئے مجسموں میں ہوسکتی ہے مگر زندہ انسانوں میں ایسی یکسانیت ممکن نہیں۔

اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے ایک کو دوسرے سے شکایت ہوتی ہے۔ایسی حالت میں اگر لوگوں کا نظریہ یہ ہو کہ جو شخص ہم سے اچھا سلوک کرے، اس کے ساتھ ہم اچھا سلوک کریں گے، اور جو شخص ہم سے برا سلوک کرے، اس کے ساتھ ہم بھی برا سلوک کریں گے۔ اگر یہ نظریہ ہو تو سماجی زندگی میں کبھی امن وسلامتی کا ماحول قائم نہیں ہوسکتا۔اس لئے آپ نے کہا کہ لوگوں کی برائی کے باوجود تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ دوسروں سے تم کو ظلم کا تجربہ ہو تب بھی تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

اس اخلاق کو قرآن میں خلق عظیم (برتر اخلاق) کہا گیا ہے۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ اس برتر اخلاق کا کامل نمونہ تھے۔

اس برتر اخلاق پر قائم ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے ایک برتر مقصد کا ہونا ضروری ہے آپ نے لوگوں کو ایک انتہائی اعلیٰ اور پاکیزہ مقصد دیا، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں کے دل میں یہ برتر مقصد پوری طرح بیٹھ جائے وہ اسی کے ساتھ ضرور اعلیٰ اخلاق والے بن جائیں گے۔

یہ برتر مقصد خدا کی معرفت ہے۔اپنے آپ کو خدا تک پہنچانا ہے۔اپنے آپ کو خدا کے قریب کرنا ہے۔جو لوگ اس مقصد کی اہمیت کو سمجھیں اور صحیح معنوں میں اللہ کے طالب بن جائیں، ان کی نظر میں ہر دوسری چیز ہیچ ہوجائے گی۔ کڑوے بول کو سہنا، نقصان کو برداشت کرنا، وقار کھونے کو گوارا کرلینا، یہ سب ان کے لئے آسان ہوجائے گا۔کیوں کہ وہ بہت بلند سطح پر جی رہے ہوں گے۔اور جو شخص

اونچی سطح پہ جئے وہ کبھی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ معلوم تاریخ میں پہلی بار آپ نے جنگ اور صلح کا صحیح انسانی اصول مقرر کیا اور اس پر خود عمل فرمایا۔

آپ نے جارحانہ جنگ کو مطلق طور پر ممنوع قرار دیا۔ آپ نے بتایا کہ جنگ صرف اس وقت کی جائے جب کہ دفاعی طور پر جنگ لڑنے کی ضرورت پیش آجائے۔ یعنی اپنی طرف سے کبھی جنگ میں پہل نہ کی جائے۔ البتہ اگر دوسرا فریق جارحیت کر دے تو اس سے بچاؤ کے لئے لڑا جا سکتا ہے۔

دوسرا ضروری اصول آپ نے یہ مقرر کیا کہ جنگ کے مقابلہ میں امن ہر حال میں بہتر اور مطلوب چیز ہے۔ اس لئے جنگ پیش آجانے کی صورت میں بھی مسلسل امن کی تلاش جاری رکھی جائے۔ اور اگر فریق ثانی صلح پر آمادہ ہو تو فوراً جنگ کو ختم کر کے اس سے صلح کر لی جائے، خواہ یہ صلح خود فریق ثانی کی یک طرفہ شرط پر کیوں نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام اصولوں کے نہ صرف داعی تھے بلکہ وہ ان کے عامل بھی تھے۔ آپ نے ان تمام اصولوں پر انتہائی اعلیٰ اور معیاری صورت میں عمل فرمایا، حتی کہ آپ کی زندگی ہمیشہ کے لئے ان تمام اصولوں کا معیاری عملی نمونہ قرار پائی۔ آپ کا کلام بھی سراسر رحمت تھا اور آپ کی زندگی بھی سراسر رحمت۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

اس دنیا میں زندگی کی صورت صرف ایک ہے۔ ممکن (Possible) پر راضی ہو کر اس کو وقفۂ عمل کے طور پر استعمال کرنا، تاکہ مستقبل میں ناممکن (Impossible) تک پہنچنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ ممکن پر راضی ہونے سے ناممکن ملتا ہے۔ جو شخص ممکن پر راضی نہ ہو اس کا سفر ہی شروع نہ ہوگا۔ پھر وہ کسی منزل تک کس طرح پہنچ سکتا ہے۔

۲۴ ستمبر کی شام کو کانفرنس کے تمام شرکا خصوصی ہوائی جہاز کے ذریعہ بن غازی لے جائے گئے۔ وہاں انھوں نے رات کا کھانا کھایا اور صدر قذافی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ تاہم میں طبیعت کی خرابی کی بنا پر بن غازی نہ جا سکا اور اس پروگرام میں شرکت نہ کر سکا۔ اس اجتماعی ملاقات کا اہتمام معمر قذافی کے روایتی خیمہ میں کیا گیا تھا۔ اس خیمہ کو اور وہاں کے آداب کو اس سے پہلے میں دیکھ چکا ہوں۔

عربی کی ایک مثل ہے: خَالِفْ تُعْرَفْ (رواج کے خلاف کام کرو، تم مشہور ہو جاؤ گے) معمر قذافی اس اصول کی دلچسپ مثال ہیں۔ وہ اپنے کو "فرزند صحرا" کہتے ہیں اور اکثر حالات میں وہ اس مثل کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ستمبر کے پہلے ہفتہ میں بلغراد (Belgrade) میں ناوابستہ ممالک (NAM) کی نویں کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر معمر قذافی اس طرح پہنچے کہ وہاں ان کے لئے چار اونٹ، دو عربی گھوڑے اور اسی کے ساتھ ان کا مخصوص عربی خیمہ بھی لے جایا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان چیزوں کے ذریعہ انھیں بلغراد میں قیام کے دوران سادگی کو برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔ معمر قذافی ہر روز صبح کو اونٹ کا دودھ ایک گلاس پیتے ہیں۔ اس کو وہ حیات بخش اور اکسیر سمجھتے ہیں۔ ان کی قیام گاہ باب العزیزی کے پاس ہر وقت کچھ اونٹ چرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

سری لنکا کے ڈاکٹر محمد شکری (۴۸ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مسلم ڈولپمنٹ بنک جدہ کے تعاون سے کولمبو میں ایک بڑا تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے جس کا نام الجامعۃ النظیمیہ الاسلامیہ ہے۔ میں نے کہا کہ ہندستان کے اردو اخبارات میں میں نے اس قسم کے مضامین پڑھے ہیں جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ سری لنکا میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ انھوں نے اس سے مکمل انکار کیا۔ انھوں نے کہا کہ سری لنکا میں اس قسم کی کوئی منظم کارروائی کا قطعاً کوئی وجود نہیں:

There is no organised oppression against Muslims in Sri Lanka.

انھوں نے بتایا کہ سری لنکا ریڈیو میں "مسلم سکشن" کے نام سے ایک مستقل شعبہ ہے۔ اس کے تحت ریڈیو سیلون پر روزانہ دو گھنٹہ کے لئے اسلامی پروگرام ہوتے ہیں۔ میں خود ہر جمعہ کو ریڈیو میں اسلامی تعلیمات کے بارہ میں تقریر کرتا ہوں۔ ہمارے یہاں کثرت سے مسلم اسکول ہیں۔ مسلم معاملات کے لئے باقاعدہ "قاضی" مقرر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان آزاد مسلم لینڈ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کی خبریں بالکل بے بنیاد ہیں۔ آزاد لینڈ کا مطالبہ تامل لوگوں کا ہے نہ کہ مسلمانوں کا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان (شمالی ہند) میں اسلام سلاطین کے ذریعہ آیا۔ وہاں جو ہندو مسلم کش مکش ہے وہ اسی تاریخی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ہے۔ اس کے برعکس سری لنکا میں اسلام تاجروں کے ذریعہ پہنچا۔ اس لئے وہاں کی تاریخ مختلف ہے اور اسی بنا پر وہاں کے دونوں فرقوں میں کوئی کش مکش بھی نہیں۔

طرابلس میں ایک افریقی خاتون بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان کا نام ڈاکٹر زینب سعید کبیر ہے۔ وہ بیرو یونیورسٹی (Bayero University) کی سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر ہیں۔ یہ یونیورسٹی کانو (نائجیریا) میں واقع ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں انگریزی الرسالہ منگاتی ہوں اور اس کی مستقل قاری ہوں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہم انگریزی الرسالہ کے مضامین کو کانو (Kano) کے پرچوں میں دوبارہ چھپواتے ہیں تاکہ وہ عوام تک پہنچ سکیں۔ ان میں سے دو انگریزی زبان کے پرچے یہ ہیں :

1. The Pen Weekly
2. The Sunday Triumph Weekly

اس کے علاوہ وہ انگریزی الرسالہ کے مضامین کا مقامی زبان (Hausa) میں ترجمہ کرتی ہیں اور ان کو مقامی ہوسا زبان کے پرچوں میں چھپواتی ہیں۔ مثلاً :

1. Al-Kalam Bi-weekly
2. Al-Fijr Weekly

ایک صاحب کناڈا سے آئے تھے۔ انھوں نے کچھ لٹریچر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کناڈا میں سرکاری سطح پر ایک تحریک چلائی جا رہی ہے جس کو وہ لوگ ملٹی کلچرلزم (Multiculturalism) کہتے ہیں۔ یہ اسی قومی ایکتا کے لئے ہے جس کو ہندستان میں نیشنل انٹگریشن (National integration)

کہا جاتا ہے۔ مگر مجھے کناڈا کی اصطلاح، ہندستان کی اصطلاح سے زیادہ پسند آئی۔ ہندستان کی اصطلاح میں بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ مختلف گروہوں کے درمیان یک جہتی کو کلچرل یکسانیت کے ذریعہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ جب کہ کناڈا کی اصطلاح واضح طور پر کلچرل تعددیت کو تسلیم کرتے ہوئے سماج کے اندر ہم آہنگی لانا چاہتی ہے۔

جس طرح ہندستان میں مختلف تہذیبی گروہ ہیں، اسی طرح کناڈا (اور دوسرے ملکوں) میں بھی مختلف تہذیبی گروہ ہیں۔ اس "اختلاف" کو "اتحاد" میں تبدیل کرنے کا راز یہ نہیں ہے کہ خود اختلاف کو ختم کرنے کی ناکام کوشش کی جائے۔ اس کا راز صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اختلاف کو بطور واقعہ تسلیم کیا جائے اور اسی کے ساتھ لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ باہمی طور پر رواداری اور احترام کے ساتھ رہیں۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ پاکستانی ہیں مگر آجکل یورپ کی ایک یونیورسٹی میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں۔ آپ ہندستانی مسلمانوں کے لئے مکی دور کو ماڈل قرار دیتے ہیں۔ اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ کیوں کہ مکی دور کا مسلمان مظلومیت کی حالت میں تھا۔ اس کا کوئی قانونی اور سیاسی حق نہیں تھا۔ جب کہ ہندستانی مسلمانوں کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ ہندستان ایک جمہوری ملک ہے۔ وہاں دستور اور قانون کا نظام ہے جو مسلمانوں کے لئے یکساں شہری حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ مکی دور کو ہم اپنے لئے ماڈل سمجھتے ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بھی مظلوم تھے اور ہم بھی مظلوم ہیں۔ ہندستانی مسلمان اور مکہ کے مسلمانوں میں جو مشابہت ہے وہ مرحلۂ دعوت کے اعتبار سے ہے نہ کہ مرحلۂ مظلومی کے اعتبار سے۔ کہ میرے نزدیک دارِ دعوت تھا۔ وہاں مسلمان داعی کی حیثیت میں تھے اور اہل مکہ مدعو کی حیثیت میں۔ اسی طرح ہندستان میں بھی مسلمان داعی کی حیثیت رکھتے ہیں اور بقیہ اہل ملک ان کے لئے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ ہندستانی مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کرنا چاہئے تو اس سے مراد مظلومانہ اخلاق نہیں ہوتا بلکہ داعیانہ اخلاق ہوتا ہے۔ کیوں کہ داعی کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں سے اعراض کرتے ہوئے اس کو اپنی دعوت حق کا مخاطب بنائے۔ اس وضاحت کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

شیخ محمد عبدہ (۱۹۰۵-۱۸۴۹) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فرانس گئے۔ وہاں انھوں نے چند سال قیام کیا۔ جب وہ اپنے وطن مصر واپس آئے تو ان سے تاثرات پوچھے گئے۔ انھوں نے کہا کہ میں

نے پایا کہ مغربی ممالک میں اسلام ہے مگر مسلمان نہیں۔ اور یہاں مسلم ملک میں مسلمان ہیں مگر اسلام نہیں (رأیت فی بلاد الغرب اسلاماً بلا مسلمین۔ ثم عدتُ هنا فوجدت مسلمین بلا اسلام)

اس سفر میں میری ملاقات دکتور عبد المنعم خطاب سے ہوئی۔ وہ مصری عالم ہیں اور ۲۰ سال سے امریکہ کی ریاست اوہائیو کے شہر تالیڈو میں رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ شیخ محمد عبدہ نے جو کچھ کہا ہے اس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے (هذا حق)

شیخ محمد عبدہ نے یہ بات کردار کے اعتبار سے کہی۔ میرے ذاتی تجربہ کے مطابق بھی یہ ایک حقیقت ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے کردار کی طاقت کھودی ہے۔ اور مغربی قوموں کی سب سے طاقت یہ ہے کہ وہ کردار کی طاقت سے مسلح ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو مغلوب اور اہل مغرب کو غالب بنا دیا ہے نہ کہ وہ نام نہاد سازشیں (موامرات)، جن کا ذکر مسلمانوں کی ہر تقریر و تحریر میں جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

موریس بکائی کی کتاب (بائبل قرآن اور سائنس) کا عربی ترجمہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ بڑی تعداد میں عربوں نے اس کو پڑھا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے کہا کہ موریس بکائی نے قرآن کا تو پوری طرح اعتراف کیا ہے، مگر انھوں نے حدیث کا انکار کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس انکار کی وجہ یہ ہے کہ موریس بکائی نے ایک نکتہ کو نہیں سمجھا۔

اصل یہ ہے کہ جس زمانہ میں قرآن اترا اس زمانہ میں ساری دنیا میں تمثیلی اسلوب رائج تھا۔ اس بنا پر حدیث میں زمانی رعایت کی بنا پر کہیں کہیں تمثیل کا اسلوب بھی ملتا ہے۔ مگر قرآن میں تمثیل کا اسلوب موجود نہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ آگ کی شدت جہنم کی سانس کی وجہ سے ہے (ان شدة الحر من فيح جهنم)، یہ تمثیل ہے نہ کہ حقیقت۔ چنانچہ قرآن میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی: قل نار جهنم اشد حراً (التوبہ ۸۱)

موریس بکائی نے اس قسم کی حدیثوں کو حقیقت پر محمول کیا اور ان کا انکار کر دیا۔ کیوں کہ سائنسی اعتبار سے یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ مئی جون کی گرمی جہنم کی پھونک سے ہو سکتی ہے۔

یہ سن کر ایک صاحب نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کے کلام میں زمانی تاثر پایا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ تاثر نہیں ہے بلکہ رعایت ہے۔ "رعایت" کا لفظ اگرچہ ایک عربی لفظ ہے۔ مگر مذکورہ عرب دوست اس کو نہ سمجھ سکے۔ آخر کار میں نے "مراعاۃ" کا لفظ استعمال کیا تو وہ فوراً سمجھ گئے۔ جس مفہوم کے لئے ہم رعایت کا لفظ بولتے ہیں، اس کے لئے موجودہ عرب مراعاۃ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات وہی ہے جو مخاطب کی فہم سے مطابقت کرے۔ جو بات مخاطب کی فہم کے مطابق نہ ہو، وہ کہے جانے کے باوجود مخاطب کے لئے لا معلوم بنی رہے گی۔ ایسی بات متکلم کی نسبت سے کہی جا چکی ہوگی، مگر مخاطب کی نسبت سے وہ ابھی تک ان کہی پڑی ہوئی ہوگی۔

شیخ امجد حیدر آبادی (۳۱ سال، طرابلس میں ایک جاپانی فرم میں کام کرتے ہیں۔ وہ اس سے پچھلے ۴ سال سے وابستہ ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جاپانیوں کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں چار سال سے جاپانیوں کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ ان لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ وہ تھکنے کو کوئی عذر نہیں سمجھتے۔ مقررہ وقت سے زیادہ کام کریں گے۔ رات کو اپنے گھر میں ہیں، کوئی کام یاد آجائے تو رات کو اٹھ کر دفتر میں آجائیں گے۔

انھوں نے کہا کہ انڈیا اور پاکستان کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر وہ چند آدمی ایک کمرہ میں ہوں تو بات زیادہ کریں گے اور کام کم۔ مگر کئی جاپانی ایک کمرہ میں ہوں تو وہ کبھی بات نہیں کریں گے۔ ہر ایک صرف اپنے کام میں مشغول ہوگا۔ جب تک وہ کام کی میز پر ہیں، وہ کام کے سوا کبھی اور کچھ نہیں کریں گے۔ ان کا ماٹو ہے — کرو یا مر جاؤ:

Do or die

میں نے پوچھا کہ آپ نے چار سال کے اندر جاپانیوں کو کبھی آپس میں جھگڑتے دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ کبھی نہیں۔ اس کے برعکس ہندستان اور پاکستان کے جو تھوڑے سے مسلمان یہاں آباد ہیں، ان میں کوئی اتحاد نہیں۔ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں ان کی اپنی کمی رکاوٹ ہے نہ کہ کسی غیر قوم کی سازش یا عناد۔

۲۷ ستمبر کو مسٹر فضل اللہ ولموٹ (۴۵ سال) سے ملاقات ہوئی۔ آجکل وہ مالیزیا کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں رجسٹرار ہیں۔ وہ آسٹریلیا میں پیدا ہوئے۔ ان کا ابتدائی نام کلائیو ولموٹ (Clive Wilmot) تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور اسلام قبول کر لیا۔ وہ انگریزی

الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کے بارے میں اپنا تاثر بتایا جس کا ایک حصہ یہ تھا:

The approach of Al-Risala to Islam is the right one, as it emphasises the position. It does not condemn others for our problems and asks Muslims to contribute to solving the problems facing Muslim men and women.

لیبیا کی سرحد پر چاڈ (Chad) ملک واقع ہے۔ یہاں مسلمان تقریباً ۴۵ فی صد کی تعداد میں آباد ہیں۔ یہاں کی آبادیوں میں اسلام بہت تیزی سے پھیلا ہے:

It has attracted a wide variety of ethnic groups (4/15).

افریقہ کے دوسرے علاقوں کی طرح، چاڈ میں بھی مسیحی مبلغوں نے مسلمانوں کو مسیحیت میں داخل کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ مگر وہ مسلم آبادی کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے:

In Chad, as elsewhere, Christian missionary work has not affected the Muslim population (4/15).

لیبیا اور چاڈ کے درمیان ایک صحرائی پٹی ہے جس کے نیچے معدنی ذخائر بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ اس کو اوزو پٹی (Aouzou Strip) کہا جاتا ہے۔ پندرہ سال پہلے لیبیا نے اس کے اندر اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ لیبیا کا حصہ ہے۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں جنگ ہوئی۔ اس میں بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا۔ ۱۹۸۹ میں لیبیا نے اس جنگ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا ہے۔ وہ اس پر راضی ہو گیا ہے کہ ہیگ کی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس جو فیصلہ کرے، وہ اس کو مان لے گا۔

یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی صورت حال ہے جو ہندستان کے نام نہاد لیڈروں نے اجودھیا کی بابری مسجد کے معاملہ میں اختیار کی۔ ابتداءً انھوں نے ریلی اور جلوس کے مظاہرے کیے۔ مارچ اور بائیکاٹ کی دھمکیاں دیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر نعرے لگائے کہ ہم بابری مسجد لے کر رہیں گے۔ اب جب کہ اس احمقانہ سیاست کے نتیجہ میں ملک کے فرقہ پرست ہندو اپنی تمام انتہاپسندی اور متشددانہ ارادوں کے ساتھ جاگ اٹھے تو اب وہ مسلمانوں سے اپیل کر رہے ہیں کہ مسجدوں میں اس کے لیے دعا کرو۔ اور یہ کہ کورٹ جو فیصلہ دے وہ ہمیں منظور ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بارہ میں فارسی

شاعر نے کہا تھا:

ہر چہ دانا کند کند ناداں   لیک بعد از خرابی بسیار

طرابلس سے ایک ہفتہ وار عربی اخبار نکلتا ہے جس کا نام ہے الدعوۃ الاسلامیہ۔ اس کے شمارہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۹ میں صفحہ اول کی پہلی سرخی یہ تھی: نصف مليون كاثوليكي في ايطاليا يدخلون الاسلام (اٹلی کے پانچ لاکھ کیتھولک مسیحی اسلام میں داخل ہو گئے) یہ خبر ایک اطالوی ہفت روزہ میگزین ایسپریسو (Espresso) کے حوالہ سے دی گئی ہے۔

اطالوی میگزین کی یہ رپورٹ اٹلی کے مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اٹلی میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، حال میں ان کی تعداد نصف ملین افراد تک پہنچ گئی ہے۔ اٹلی میں مسلمانوں کی تعداد اب وہاں کے یہودیوں سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس طرح اب اٹلی میں اسلام تعداد کے اعتبار سے مسیحیت کے بعد نمبر ۲ پر ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان نکاح کی صورت میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مسیحی (عورت یا مرد) اپنے دین کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیتے ہیں (في حالات الزواج بين المسلمين والمسيحيين، فان المسيحيين هم الذين يتخلون عن دينهم)

اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ناقابل تسخیر حد تک عظیم ہے۔ مگر اسلام کا یہی وہ امتیازی وصف ہے جس سے موجودہ زمانہ کے فریادی مسلم رہنما سب سے زیادہ بے خبر ہیں۔

۲۴ ستمبر کی شام کو میری طبیعت خراب ہو گئی۔ کانفرنس کے منتظمین مجھ کو قریب کے ایک اسپتال میں لے گئے۔ یہ نسبتاً ایک چھوٹا اسپتال تھا۔ وہاں ایک مصری ڈاکٹر نے میرا بلڈ پریشر وغیرہ دیکھا اور ایک انجکشن اور ایک دوا تجویز کی۔ پورا اسپتال تو میں نہ دیکھ سکا۔ تاہم اسپتال کے اندر چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہاں کوئی مریض نہیں۔ ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر وغیرہ تو مجھے نظر آئے۔ مگر وہاں مجھے کوئی مریض دکھائی نہ دیا۔ ہندستان میں مریض ہیں مگر اسپتال نہیں۔ یہاں اسپتال ہیں مگر مریض نہیں۔

۲۴ ستمبر کو دن کا کھانا کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ میں تھا۔ یہ بہت بڑے رقبہ میں جدید طرز پر بنائی گئی ہے۔ آجکل "کلیۃ الدعوۃ" کے نام پر اکثر مسلم ملکوں میں تعلیمی ادارے قائم ہیں جن کا مقصد اسلام کے داعی تیار کرنا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک نہایت مفید کام ہے۔ مگر موجودہ صورت وہ عیسائی مبشرین

اور مبلغین کے رد عمل میں شروع ہوا ہے۔ اس لئے کسی بھی کلیہ میں پورے معنی میں صحیح دعوتی ماحول موجود نہیں۔

کانفرنس کی طرف سے ہوٹل کے ایک کمرہ میں رزرویشن آفس کھلا ہوا تھا۔ ۲۷ ستمبر کو میں وہاں گیا تاکہ واپسی کے رزرویشن کے لئے ان کو اپنا ٹکٹ دے دوں۔ انھوں نے کہا کہ واپسی کے لئے ہم آپ کا رزرویشن کویت کے راستہ سے کر رہے ہیں۔ چوں کہ کویت میں اگلی پرواز کے لئے اچھا کنکشن نہیں تھا، اس لئے میں نے کہا کہ نہیں۔ اس کے بجائے آپ کراچی کے راستہ سے میرا رزرویشن کریں۔ انھوں نے دوبارہ کویت کے راستہ سے رزرویشن کرانے کی بات کی۔ اس پر میری زبان سے نکل گیا: لا ابداً۔

اس کے بعد اچانک مجھے خیال آیا کہ دنیا کے سفر میں تو میں اپنی پسند کے خلاف راستہ پر سفر کرنے کے لئے "لا ابداً" کہہ کر انکار کر رہا ہوں۔ مگر آخرت کے سفر کا معاملہ سراسر اس سے مختلف ہوگا۔ وہاں کسی شخص کے لئے انکار کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ آخرت کا سفر، دنیا کے سفر سے کتنا زیادہ مختلف ہوگا۔ مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

ہوٹل کے رسپشن میں ایک بہت بڑی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف معمر قذافی کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ پس منظر میں "مصنوعی دریا" کا پانی موجیں مارتا ہوا بہتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا —— انسانی دریا بنانے والا عظیم انسان:

The great man-river builder.

لیبیا میں پانی سپلائی کا نیا تجربہ کیا گیا ہے۔ چشموں کے پانی کو ذخیرہ کرکے اس کو بہت بڑے پائپ میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہ پائپ صحراؤں سے گزرتا ہوا سیکڑوں میل دور کے مقام پر پہنچتا ہے اور خشک زمینوں کی آبپاشی کرتا ہے۔

پہلی نظر میں دیکھئے تو یہ "مصنوعی دریا" ایک انسان (معمر قذافی) نے بنایا۔ مزید غور کیجئے تو یہ پٹرو ڈالر کا کارنامہ نظر آئے گا۔ اور زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ سراسر خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ کیوں کہ اسی نے پانی کے ذخائر پیدا کئے۔ پھر اسی نے وہ تمام امکانات پیدا کئے جن کو استعمال کرکے کوئی شخص اس قابل ہوتا ہے کہ وہ صحراؤں میں دریائیں اور نہریں جاری کرے۔ ہر واقعہ بالآخر خداوند ذو الجلال کا کارنامہ ہے۔ مگر بے خبر انسان اس کو دوسری چیزوں

کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ موجودہ دنیا کے تمام واقعات اپنی حقیقت کے اعتبار سے شکر کی طرف لے جارہے ہیں۔ مگر دنیا میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو واقعات سے شکر کی غذا لیتے ہوں۔

ہوٹل میں میرا قیام اس کی نویں منزل میں تھا۔ ۲۸ ستمبر کی صبح کو مجھے نیچے اترنا تھا۔ لفٹ میں داخل ہو کر میں نے نمبر ۹ کا بٹن دبایا۔ مگر لفٹ حرکت میں نہیں آئی۔ میں بار بار دباتا رہا مگر وہ مطلق متحرک نہ ہو سکی۔ میں نے سمجھا کہ یہ خراب ہے۔ اور ارادہ کیا کہ اس کو چھوڑ کر دوسری لفٹ میں چلا جاؤں۔ اچانک خیال ہوا کہ میں غلط بٹن دبا رہا ہوں۔ نمبر ۹ تو اس منزل کا بٹن تھا جس پر بر وقت میں موجود تھا۔ مجھ کو در اصل صفر (۰) والا بٹن دبانا چاہئے تھا۔ چنانچہ اگلے لمحہ میں نے صفر کا بٹن دبایا تو فوراً لفٹ نے مجھے نیچے پہنچا دیا۔

اس دنیا میں کوئی حقیقی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے صرف حرکت کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حرکت صحیح ہو۔ غیر صحیح حرکت کبھی اس دنیا میں نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی، خواہ اس کو سیکڑوں سال تک جاری رکھا جائے۔

۲۸ ستمبر کو جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز مسجد مولای محمد میں پڑھی۔ وہاں پہنچ کر مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب تیزی سے چلتے ہوئے میری طرف آئے۔ انھوں نے میرے قریب آکر کہا:
یا شیخ ادع لی ولذریتی ۔۔۔ اسمی محمد الحمال

اصل یہ ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی گوشہ ایسا ہوتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ جہاں اس کے وسائل اس کو ناکافی نظر آتے ہیں۔ جہاں وہ کسی برتر مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس جذبہ کا صحیح استعمال اللہ کو پکارنا ہے۔ مگر انسان جب اللہ کو نہیں پاتا تو وہ زندہ یا مردہ انسانوں کو پکارنے لگتا ہے۔

امام صاحب نے طویل خطبہ دیا۔ اس عربی خطبہ میں انھوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ مثلاً انھوں نے یہ حدیث سنائی: قلیل العلم خیر من کثیر العبادۃ (تھوڑا علم زیادہ عبادت سے بہتر ہے) اس کی تشریح انھوں نے خالص روایتی اور تقلیدی انداز میں کی۔ اس قسم کی تشریح آج کے انسان کے ذہن کو نہیں جھنجھوڑتی۔ وہ اس کے فکر کا جزء نہیں بنتی۔ وہ تقدس اور احترام کے جذبہ کے تحت اس کو سن لیتا ہے، اور اس کے بعد اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

اس حدیث میں علم سے مراد عام علم نہیں، بلکہ اس سے مراد دینی شعور یا معرفت حق ہے ۔ یہ حدیث دراصل یہ بتاتی ہے کہ اسلام میں اصل اہمیت کی چیز کیا ہے۔ اسلام میں اصل اہمیت کی چیز کیفیت (Quality) ہے۔ مجرد کمیت یا مقدار (Quantity) کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں۔

سبراتہ (Sabratha) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے جو طرابلس کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کو قرطاجنہ والوں (Carthaginians) نے تجارتی مرکز کے طور پر چوتھی صدی قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ ۴۶ اق م میں یہاں رومی آئے۔ انھوں نے یہاں اپنا مشہور تھیٹر تعمیر کیا جس کے عظیم کھنڈر اب بھی سمندر کے کنارے موجود ہیں۔ عربوں نے اس کو ۶۴۳ء میں فتح کیا۔

یہ تھیٹر وہ مقام ہے جہاں رومی لوگ شاہانہ تفریح کیا کرتے تھے۔ آج اس کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر صرف تاریخی عبرت کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ شاید اسی طرح کی یادگاروں کے بارہ میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ زمین میں چلو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا (الانعام ۱۱)

یہاں کے کچھ حضرات مجھ کو مالٹا لے جانا چاہتے تھے۔ یہ طرابلس اور روم کے درمیان ایک جزیرہ ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہاں عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع کریں اور اسلامی دعوت کے موضوع پر ان سے گفتگو کی جائے۔ مگر وقت کی کمی کی بنا پر میں ان لوگوں کی اس پیش کش کو قبول نہ کر سکا۔ آئندہ کسی موقع پر انشاء اللہ مالٹا جانے کی کوشش کروں گا۔

کچھ لوگوں نے تیونس جانے کی بھی پیش کش کی۔ وہاں بہت سے عرب نوجوان الرسالہ کے مشن سے متاثر ہیں۔ وہ عربی اور فرانسیسی زبان میں الرسالہ کے مضامین کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ مگر اس سفر کے تحت میں تیونس کا پروگرام بھی نہ بنا سکا۔ انشاء اللہ آئندہ کسی وقت وہاں جانے کی کوشش کروں گا۔ کچھ لوگ دمشق سے آئے تھے، وہ واپسی میں مجھ کو دمشق لے جانا چاہتے تھے۔ مگر میں اس فرمائش کو بھی پورا نہ کر سکا۔

تیونس میں ایک تاریخی شہر ہے جس کا نام سوسہ ہے۔ یہاں تاریخی یادگاریں ہیں جن کو دیکھنے کے لئے یورپ کے سیاح کثرت سے آتے ہیں۔ عبد المنعم محمد الماقوری (۲۱ سال) نے بتایا کہ وہ اگست ۱۹۸۹ میں سوسہ گئے۔ ان کے ساتھ جمعیۃ الدعوۃ کی طرف سے چھپی ہوئی انگریزی اور فرانسیسی

کتابیں (قرآن کا ترجمہ، موریس بکائی کی کتاب، وغیرہ) تھیں۔ وہ ان کتابوں کو یورپی سیاحوں کے درمیان تقسیم کرنے لگے۔ دو دن تقسیم کرنے کے بعد جب وہ تیسرے دن وہاں گئے تو کچھ لوگ ان پر غضب ناک ہوگئے۔ وہ عبد المنعم باتوری کو مارنے لگے۔

میں نے پوچھا کہ جس وقت وہ لوگ مار رہے تھے، اس وقت آپ کے اندرونی احساسات کیا تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے مار کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنے عمل (اسلامی کتابوں کی تقسیم) کو جاری رکھا۔ اور میں اس کو اپنی سعادت سمجھ رہا تھا (لکننی لم ابال بالضرب وواصلت عملی وکنت سعیدا بذالك) انھوں نے کچھ یورپی نوجوانوں کو اسلام میں داخل کیا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت کا عمل آدمی کے اندر کس طرح دوسرے تمام عمدہ اوصاف پیدا کر دیتا ہے۔ یہ احساس کہ میرے پاس نجات انسانی کا پیغام ہے اور میں اس کو دوسروں تک پہنچا رہا ہوں، وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس سے اعلیٰ احساس اور کوئی نہیں۔ جن لوگوں کے اندر داعیانہ جذبہ جاگ اٹھے ؛ وہ اسی کے ساتھ خود بخود شریف اور خیر خواہ اور جری اور بہادر اور حوصلہ مند انسان بن جائیں گے۔ حق کو پانے کا احساس ان کو ہر دوسری چیز کو کھونے کے قابل بنا دے گا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی چیز کیوں نہ ہو۔

عرب نوجوانوں میں بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے ہیں جو اسلامی مرکز اور الرسالہ مشن سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ وہی سوالات وہاں بھی کئے گئے جو ہندستان میں اس کے بارہ میں کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مجلس میں الجزائر کے ایک نوجوان نے پوچھا کہ آپ باتیں تو بہت صحیح اور اچھی کہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی عملی پروگرام (برنامج) نہیں۔

میں نے کہا کہ وہ چیز جس کو عملی پروگرام کہا جاتا ہے، اس سے زیادہ آسان اور کوئی کام نہیں۔ ہر آدمی جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہو، وہ کاغذ پر ایک ایسا نظام مرتب کر کے پیش کر سکتا ہے جو لوگوں کو پروگرام دکھائی دینے لگے۔ مگر حقیقی اسلامی دعوت اس سے زیادہ بڑا کام ہے کہ وہ کسی پروگرام کے اندر سما سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت اور حدیث کی کتابوں میں ہم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو موجودہ مفہوم میں کوئی پروگرام تلقین کرتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ تخریب کے لئے پروگرام بنائے جا سکتے ہیں، لیکن تعمیر کے لئے کوئی لگا بندھا

پروگرام نہیں۔ گہری تعمیر کے کام میں لوگوں کے شعور کو اتنا ابھارنا پڑتا ہے وہ خود حالات کے اعتبار سے پروگرام کی تخلیق کر سکیں۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہم پروگرام ساز انسان تیار کریں (ربنا ابعثنا هو اعداد المبرمجين)

ایک مجلس میں میں نے اپنی "غیر عرب عربی" پر معذرت کی۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ آپ کی عربی، زبان کے اعتبار سے، عربوں جیسی نہیں ہوتی۔ مگر وہ ہم کو زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ کیوں کہ وہ محدد زبان (Precise language) میں ہوتی ہے۔ جب کہ عام بولنے والوں کا مفہوم ان کی خطابت اور الفاظ کی کثرت میں گم ہو جاتا ہے۔ آدمی ان کی لمبی چوڑی تقریر سن کر اس حال میں اٹھتا ہے کہ اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کہنے والے نے کیا کہا۔

اس سفر میں بہت سے عربوں سے اسلامی دعوت کے بارہ میں گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کی ایک مجلس میں تقریباً تین گھنٹہ تک گفتگو رہی۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر موجودہ زمانہ میں دعوت کے مسائل اور حکمت دین تھا۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک بار کہا: نصف العلم ان تعرف الفرق وبقية نصفه ان تعرف المماثلة۔ یعنی نصف علم یہ ہے کہ آدمی دو چیزوں کے درمیان فرق کو جانے، علم کا بقیہ نصف یہ ہے کہ آدمی دو چیزوں کے درمیان مشابہت کو جانے۔

لوگوں کے مزید سوالات کے درمیان میں نے اس فقرہ کی تفصیلی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ پہلے "فرق" کو جاننے کے معاملہ کو لیجئے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پچھلے زمانہ میں جو پیغمبر توحید کی دعوت لے کر اٹھے، ان کا اپنے زمانہ کے حکمرانوں سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس بنا پر آج کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دینی دعوت کے پیغمبرانہ دعوت ہونے کی پہچان یہ ہے کہ وقت کے حکمراں طبقہ کے ساتھ فوراً ہی اس کا ٹکراؤ پیش آجائے۔ اب الرسالہ مشن (یا تبلیغی جماعت) کا چونکہ حکومت سے ٹکراؤ نہیں ہو رہا ہے اس لئے ان کے نزدیک یہ اس کے غیر پیغمبرانہ نہج پر ہونے کی دلیل ہے۔

یہ غلط فہمی "فرق" کو نہ جاننے کی بنا پر ہے۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ اپنا حق حکومت مشرکانہ عقائد کے ذریعہ حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ توحید کی دعوت انھیں براہ راست اپنی حاکمانہ حیثیت سے ٹکراتی ہوئی نظر آتی تھی، وہ فوراً توحید کی دعوت کو کچلنے کی کوشش کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ

میں جمہوری انقلاب کے نتیجہ میں یہ صورت حال ختم ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اب قدیم طرز کے ٹکراؤ کا کوئی سوال نہیں۔ جو لوگ قدیم بادشاہت اور موجودہ حکومت کے فرق کو نہ جانیں وہ اس معاملہ میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔

اب اس مشابہت کے معاملہ کو لیجئے۔ موجودہ زمانہ کے اسلام پسند لوگ سیکولرزم کو اسلام کا دشمن نظریہ سمجھتے ہیں اور غیر ضروری طور پر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ عین صلح حدیبیہ کے مثل ایک واقعہ ہے۔ حدیبیہ کا واقعہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ تھا کہ وقت کے اقتدار نے دس سال کے لئے اپنے آپ کو اس کا پابند کر لیا تھا کہ وہ اسلامی دعوت کے مقابلہ میں عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہے گا۔ عین یہی موجودہ زمانہ میں سیکولر حکومت کا مطلب بھی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جدید افکار کے زیر اثر دنیا کی تمام حکومتوں نے اپنے آپ کو اس کا پابند کیا ہے کہ وہ مذہب کے معاملہ میں عدم مداخلت کا طریقہ اختیار کریں گے۔ اقوام متحدہ کی سطح پر اسی عالمی عہد کا نام "حقوق انسانی کا منشور" ہے۔ یہ صورت حال گویا ابدی صلح حدیبیہ ہے۔ دونوں کے درمیان "حدیبیہ اسپرٹ" مشترک طور پر موجود ہے۔ مگر اس مشابہت کو نہ جاننے کی وجہ سے لوگ اس کے خلاف بھڑک اٹھے۔

ایک مجلس میں کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کے اندر غیر جہادی اور غیر انقلابی ذہن بنا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل لغو اور سطحی بات ہے۔ ایسا کہنے والوں نے ابھی تک ہمارے مشن کو نہیں سمجھا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد اسلامی مفکرین نے اپنی سیاسی تعبیر کے ذریعہ دعوت کا نشانہ بدل دیا ہے۔ انھوں نے انقلابِ نظام کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنا دیا ہے۔ حالاں کہ انقلابِ انسان اسلامی دعوت کا نشانہ ہے۔ اسی تعبیری فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے دعوتی عمل میں "سیاسی انقلاب" بطور نشانہ حذف ہے، دوسری طرف ان کے دعوتی عمل میں توجہ الی اللہ بطور نشانہ حذف ہے۔

اب جو لوگ سیاست رخی تعبیر سے متاثر ہیں، وہ ہمارے معاملہ کو سمجھ نہیں پاتے اور ہمارے اوپر غیر انقلابی ہونے کا الزام دینے لگتے ہیں۔ مگر یہ غلط فہمی قرآن کے زیر تاثر نہیں بنی ہے بلکہ بعض لوگوں کی سیاسی تعبیر دین کے زیر تاثر بنی ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں ان الزامات سے غیر متاثر

رہ کر اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ ان شاء اللہ لوگوں کی یہ بے جا بدگمانیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

ایک تعلیم یافتہ عرب نوجوان نے کہا کہ میں نے آپ کی تمام عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ پر کیا اثر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ ان کتابوں نے مجھ کو نہایت اونچے مقام تک پہنچا دیا (انها رفعتني الى مقام عظيم)

ایک عرب نوجوان نے کہا کہ میں ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں جس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم یوروپین موجود ہیں۔ میں ان کو آپ کی انگریزی کتابیں پڑھا رہا ہوں۔ ایک مسیحی خاتون جو مذکورہ کمپنی میں سکریٹری کے درجہ پر ہیں۔ ان کو "پرافٹ آف ریولیوشن" انھوں نے پڑھنے کے لئے دی۔ اس کو پڑھ کر خاتون نے جو کچھ کہا وہ عرب نوجوان کے الفاظ میں یہ تھا کہ میں نے جو کتابیں پڑھی ہیں، ان میں یہ بہترین کتاب ہے (انه احسن كتاب قرأته)

ایک مجلس میں ایک عرب نوجوان نے دعوت کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ تکمیلی اعتبار سے اسلامی دعوت کے چار مراحل ہیں۔ اعلان، ہجرت، جہاد، حکومت۔ میں نے کہا کہ اسلامی دعوت کی یہ تعبیر صحیح نہیں۔ صحیح تعبیر وہ ہوتی ہے جو دوسرے متعلق حقائق سے نہ ٹکرائے، جب کہ یہ تعبیر دوسری معلوم حقیقتوں سے ٹکرا رہی ہے۔ مثلاً ہمارے عقیدہ کے مطابق، تمام انبیاء کامل معنوں میں داعی تھے۔ مگر اس تعبیر میں بیشتر انبیاء ناقص داعی قرار پاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی دعوت ان چاروں مراحل سے نہیں گزری۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کی مخاطب امتوں کو جو عذاب دیا وہ عین عدل تھا۔ مگر اس تعبیر میں وہ غیر عادلانہ قرار پاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے مطابق بیشتر مثالوں میں خدا نے ان قوموں کو قبل از وقت عذاب دے دیا۔

اصل یہ ہے کہ دعوت تمام تر اعلان ہی کا نام ہے۔ البتہ اعلان کے شرائط ہیں۔ مثلاً مدعو کے لئے خیر خواہ ہونا، اس کی ایذاء پر صبر کرنا، اس کی سرکشی کے باوجود مسلسل اس کو پکارتے رہنا۔ اس کی اپنی لغت میں دعوت کو اس کے لئے قابل فہم بنانا، مدعو سے اجر دنیوی کا طالب نہ ہونا وغیرہ۔ اسی کا نام دعوت ہے۔ اس کے بعد ہجرت یا جہاد، یا قتال یا حکومت جیسے واقعات جو کبھی پیش آتے ہیں اور کبھی پیش نہیں آتے، وہ سب تاریخ کے مراحل ہیں نہ کہ دعوت کے مراحل۔

ایک مجلس میں موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کا ذکر آیا۔ پھر یہ سوال ہوا کہ یہ تمام تحریکیں اپنے

مقصد میں ناکام کیوں ہوگئیں۔ ایک صاحب ان رکاوٹوں کی فہرست بتانے لگے جنھوں نے ان اسلامی تحریکوں کو ناکام کر دیا۔ میں نے کہا کہ یہ سوچ صحیح نہیں۔ اس دنیا میں تو لازماً یہی ہونا ہے کہ یہاں رکاوٹیں پیش آئیں۔ ہمیں رکاوٹوں کے باوجود اپنے مقصد کو حاصل کرنا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ ایک مستشرق کے الفاظ میں، آپ نے رکاوٹوں کو اپنے لئے زینہ بنالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تحریکیں صرف اس لئے ناکام ہوگئیں کہ وہ رکاوٹوں یا ڈس ایڈوانٹج کو اپنے لئے ایڈوانٹج نہ بناسکیں (هذه الحركات الاسلامية كلها فشلت بسبب واحد۔ انها لم تستطع ان تستغل الموانع لهم كفرص)

ایک عرب نوجوان مختار احمد (۲۶ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس سے پہلے سیاسی اسلامی جماعتوں سے متاثر تھے۔ ان کے دماغ میں مار دھاڑ والا اسلام بسا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بعد آپ کی عربی کتابیں پڑھنے کو ملیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن بالکل بدل گیا۔ ان کو پڑھ کر میرے دماغ کا بوجھ اتر گیا۔ اب میں اپنے ماضی اور حال کو سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ میں قید خانے سے باہر آگیا ہوں (كأني خرجتُ من السجن)

عرب ممالک میں بہت بڑا دعوتی موقع پٹروڈالر کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ آجکل کثرت سے بیرونی ملکوں کے غیر مسلم ماہرین اور کارکن عرب ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان آسانی کے ساتھ دعوتی کام کیا جاسکتا ہے۔

ایسے کئی عرب نوجوان ملے جو اس دعوتی امکان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ محمد المجانی (۳۰ سال) نے بتایا کہ وہ جس کمپنی میں کام کرتے ہیں، اس میں ایک برطانی اکسپرٹ ہے جس کا نام براٹن کوپنگ (Brain Copping) ہے۔ محمد المجانی نے اس برطانی کو گاڈ ارائزز اور دوسری کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔ اس کے بعد اس کا تاثر پوچھا۔ سوال سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد بولا: جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ بالکل حق ہے۔ اس نے مزید کہا کہ مجھے برطانیہ کا کوئی شخص نہیں معلوم جو اتنی طاقت کے ساتھ خدا اور مذہب کے اثبات پر کتاب لکھ سکے۔

طارق الکردی (۲۷ سال) ایک عرب نوجوان ہیں۔ وہ الجزائر میں تھے۔ وہاں انھوں نے آئرلینڈ کی ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرلی۔ اس کا نام گرالڈین (Geraldine Sheehen) ہے۔

شادی کے بعد وہ برابر اس کو ترغیب دیتے رہے کہ وہ اسلام قبول کرلے۔ مگر وہ راضی نہ ہوسکی۔ حتی کہ اسلام سے نفرت کا اظہار کرتی رہی۔

۲۷ ستمبر کو ایک ملاقات میں طارق الکردی نے بتایا کہ پہلے میں اسلام کو اس کے سامنے فقہی اور تقلیدی انداز میں پیش کرتا تھا۔ اس کے بعد مجھے انگریزی الرسالہ ملا۔ میں نے اس کو انگریزی الرسالہ کے کچھ شمارے پڑھائے۔ ان کا بیان ہے کہ جب میں نے اس کو انگریزی الرسالہ پڑھایا تو اس کو پڑھ کر وہ رو پڑی (فبکت) اب اسلام اس کو عین فطرت کا دین نظر آیا۔ اس نے پوری رضامندی کے ساتھ اسلام قبول کرلیا اور کہا:

I feel I knew this before. It's not a new thing for me.

مذکورہ خاتون کو تعدد ازواج کے مسئلہ پر سخت اعتراض تھا۔ طارق الکردی نے اس کو انگریزی الرسالہ (اگست ۱۹۸۹) پڑھنے کے لئے دیا۔ اس کو پڑھ کر خاتون نے کہا کہ اب میں نے اسلام کے اس مسئلہ کو مان لیا۔ اب مجھے اسلام کے بارہ میں کوئی شک نہیں۔

۲۸ ستمبر کو دوپہر کا کھانا "ذات العماد" میں تھا۔ کھانے کی میز پر میرے علاوہ تین عرب تھے۔ ایک عرب بزرگ نے اپنی گفتگو کا آغاز اس عربی مثل سے کیا: ان کان الکلام من الفضة فالسکوت من الذهب (بولنا اگر چاندی ہے تو چپ رہنا سونا ہے) اس کے بعد انھوں نے بولنا شروع کیا تو وہ مسلسل بولتے رہے۔

کافی دیر تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں میں نے ان سے کہا: یا اخی اتحبُّ الذهب ام الفضة (آپ سونا پسند کرتے ہیں یا چاندی) انھوں نے ایک لمحہ سوچا۔ اس کے بعد سنجیدگی کے ساتھ بولے: اُفَضِّلُ الذهب ولکن عندی الفضة (میں سونے کو اچھا سمجھتا ہوں، مگر میرے پاس چاندی ہے)

یہ عربوں کی ممتاز خصوصیت ہے کہ وہ فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتے ہیں۔ مگر یہی بات ہندستان اور پاکستان میں تقریباً معدوم کے درجہ میں ہے۔ یہاں ہر آدمی اسلام کے نام پر بے تکان بول رہا ہوگا۔ لیکن اس کی کسی کمزوری یا غلطی کی طرف توجہ دلایئے تو وہ کبھی اس کا اعتراف نہیں کرے گا، خواہ

۱۔ رابطہ عالم اسلامی (مکہ) کے تحت ایک ادارہ قائم ہے جس کا نام هيئة الاعجاز العلمي في القرآن والسنة ہے۔ اس کا صدر دفتر مکہ میں ہے۔ اس ادارہ کے عرب نمائندہ احمد الصاوی ۲۰ نومبر ۱۹۸۹ کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع یہ تھا: "قرآن کی صداقت پر جدید سائنسی دلائل"

۲۔ الرسالہ کی دعوت اس حد تک پھیل چکی ہے کہ اب تمام لوگ اسی کی بولی بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً تعمیر حیات (۲۵ نومبر ۱۹۸۹) میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا بیان چھپا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بابری مسجد کے قضیہ کو سڑک پر لانا غلط تھا۔ "موجودہ دھماکہ خیز صورت حال پر قابو پانے" کا یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ "مسلمان اس موقع پر فریق ثانی کی تقریروں سے اشتعال میں نہ آئیں۔ وہ پُر امن رہیں"۔ مسلمانوں کے سیاسی قائدین سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ ملکی فضا کو "اس قابل رہنے دیں کہ برادران وطن اسلام کی تعلیمات کا ٹھنڈے دل و دماغ سے مطالعہ کر سکیں"۔ یہ سب عین الرسالہ کی باتیں ہیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ کی ۱۳ سالہ جدوجہد اب کامیابی کے نئے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔

۳۔ نئی دہلی کے علاقہ میں ایک عیسائی چرچ ہے جس کا نام (St. Michael's Church) ہے۔ اس چرچ کے منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ۱۴ نومبر ۱۹۸۹ کو وہاں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر اسلام کے تعارف پر تھی۔ تقریر میں سادہ طور پر بتایا گیا کہ اسلام کیا ہے اور اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ تقریر آدھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ اس کے بعد حاضرین کی طرف سے سوالات کیے گیے جن کا جواب صدر اسلامی مرکز نے دیا۔ حاضرین میں زیادہ تر عیسائی اور ہندو صاحبان تھے۔

۴۔ مالدیپ کے ہفت روزہ اخبار ہویر (Haveer) کے نمائندہ مسٹر محمد وحید ۲۵ نومبر ۱۹۸۹ کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو مذکورہ مالدیپی ہفت روزہ میں شائع ہوگا۔ انٹرویو کا موضوع زیادہ تر "عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل" تھا۔ وہ مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات اپنے ساتھ لے گیے۔

۵۔ جناب بلال الدین صاحب بھوپالی نے بتایا کہ جناب قمر عالم صاحب جو سعودی عرب میں انجینیر ہیں، وہ الرسالہ انگریزی پابندی سے منگاتے ہیں اور ہر ماہ اس کی پچاس کاپی نکال کر تعلیم یافتہ

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ کام وہ جدید قسم کی فوٹو کاپی مشین کے ذریعہ کرتے ہیں۔
الرسالہ کی سلائی کھول کر اس کے اوراق اس میں رکھ دینا کافی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۵ کا بٹن
دبانے سے اپنے آپ تمام اوراق دونوں طرف چھپ کر نکل آتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک رسالہ
سے ۵۰ رسالہ بنا کر اس کو ہر ماہ لوگوں کے درمیان پھیلا رہے ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر شمس الآفاق الہ آبادی دو مہینے (اکتوبر - نومبر ۱۹۸۹) کے لیے باہر کے ملکوں کے سفر پر گیے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے امریکہ، کوریا، چین وغیرہ کا سفر کیا۔ وہ اپنے ساتھ انگریزی الرسالہ اور مرکز کی انگریزی کتابیں بھی لے گیے تھے۔ ہر جگہ انھوں نے لوگوں سے گفتگو کی اور رسالہ اور کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ امریکہ کی ایک کانفرنس میں بہت سے پروفیسر شریک تھے۔ ان سب کو انھوں نے ایک ایک الرسالہ دیا۔ ایک امریکی پروفیسر نے مذہب کے بارہ میں بے اعتقادی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات دیں۔ ان کو پڑھ کر مذکورہ پروفیسر نے کہا:

I was very much impressed.

۷۔ کویت کے عربی مجلہ المجتمع کے نمائندہ عبد العزیز محمد ۱۵ نومبر ۱۹۸۹ کو مرکز میں آتے اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع زیادہ تر فلسطین کا مسئلہ تھا۔

۸۔ ایک امریکی ادارہ انٹرنیشنل ریلیجس فاونڈیشن (نیویارک) نے ۹۲۱ صفحات پر مشتمل ایک انگریزی کتاب تیار کی ہے۔ اس کا نام (World Scripture) ہے۔ اس کتاب کو نیویارک کا اشاعتی ادارہ نیو ایرا بک (New Era Book) شائع کر رہا ہے۔ اس کتاب میں دوسرے مذاہب کے علاوہ اسلام کا مفصل تعارف ہے۔ اس تعارف میں اس کے اڈیٹر نے دوسرے انگریزی تراجم قرآن کے علاوہ صدر اسلامی مرکز کے مشوروں اور ان کی فراہم کردہ معلومات سے بھی مدد لی ہے جس کا ذکر مذکورہ کتاب کے دیباچہ میں کیا گیا ہے۔

۹۔ مسٹر ہوکیش کوشک نے اخبار پانچ جنیہ کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا خاص موضوع یہ تھا کہ مسلم ملکوں میں غیر مسلم اقلیتوں کی سماجی اور اقتصادی حالت کیا ہے۔ یہ انٹرویو ۱۵ نومبر ۱۹۸۹ کو اسلامی مرکز کے دفتر میں لیا گیا۔

۱۰۔ مسز انیس جنگ ٹائمس آف انڈیا کی کالم نگار ہیں۔ انھوں نے ٹائمس آف انڈیا کے لیے ۲۷ نومبر ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا خاص موضوع یہ تھا کہ کیا

مسلمانوں کی مشکلات اور پس ماندگی کا ذمہ دار اسلام ہے۔ ان کے مختلف سوالات کے جواب میں جو باتیں کہی گئی، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی مشکلات و مسائل کی ذمہ داری صرف دو چیزوں پر ہے۔ (۱) ان کی حد درجہ نااہل قیادت (۲) ان کا تعلیم میں پیچھے ہونا۔ یہ انٹرویو ٹائمس آف انڈیا ۱۰ دسمبر ۱۹۸۹ میں شائع ہوا ہے۔

۱۱- تبت ہاؤس نئی دہلی کی طرف سے ۲۵ نومبر ۱۹۸۹ کو ایک کل ہند سیمنار تھا جس کا عنوان تھا (Religion and Ecology) اس موقع پر اسلامی مرکز کو اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے اسلامی مرکز کی نمائندگی کرتے ہوتے مذکورہ موضوع پر ایک پیپر پیش کیا۔ اس سیمنار کی کارروائیاں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں انجام پائیں۔

۱۲- ارشاد احمد صاحب (بنگلور) نے بتایا کہ بنگلور میں انگریزی الرسالہ کے ذریعہ غیر مسلموں میں دعوت پہونچانے کا کام منظم انداز میں کیا جارہا ہے۔ مقامی قارئین الرسالہ نے ایک فنڈ بنایا ہے۔ اس فنڈ کے ایک جزء سے ہر ماہ ۲۵ - ۳۰ تعلیم یافتہ غیر مسلموں کو انگریزی الرسالہ بذریعہ پوسٹ بھیجا جاتا ہے۔ اس طرح چند مہینہ تک بھیجنے کے بعد انھیں خط لکھا جاتا ہے اور ان کا تاثر پوچھا جاتا ہے۔ جن لوگوں کی طرف سے جوابات موصول ہوتے ہیں ان سے ملاقات کرکے مزید گفت گو کی جاتی ہے۔ اسی طرح دستی طور پر بھی انگریزی الرسالہ پہونچانے کی مہم چلائی جارہی ہے۔ اس مہم کے مثبت نتائج ظاہر ہو رہے ہیں۔

۱۳- ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے آپ کے الرسالہ کے مضامین سے کافی استفادہ کیا ہے۔ میرا ذاتی مزاج انتقامی تھا۔ دینی کام بھی بطور رسم ادا کرتا تھا۔ لیکن آج اللہ کے کرم سے اور دعوت الرسالہ سے بالکل ہی زندگی میں تبدیلی واقع ہوگئی۔ اکثر جگہ دوران گفتگو الرسالہ کے مضامین سے لوگوں کو دعوت دیتا ہوں (حفیظ اللہ اعوان، پونچھ)

۱۴- ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ میری روح کی غذا ہے۔ جہاں ہر طرف مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی فتنے سر اٹھا رہے ہیں، الرسالہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کرکے گویا اتمام حجت کر رہا ہے۔ عام جماعتیں نوجوانوں کو جذباتی اور سطحی بنا کر ان کا استحصال کر رہی ہیں۔ جب کہ الرسالہ ان میں سنجیدگی، صحیح فکر اور حقیقت پسندی پیدا کرکے انھیں کامیابیوں سے ہم کنار کر رہا ہے (قاری محمد اسماعیل۔ بنگلور)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بحری ڈاک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسؤل نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

ISLAM

In Contemporary Language



AL-RISALA monthly has a two-fold aim: first, to introduce Islam as a divine message; second, to promote positive and constructive thinking among the people. It is published in Urdu and English by the Islamic Centre, New Delhi.

To receive your copies of this thought-provoking magazine regularly, subscribe NOW.

Ask for a free sample copy.

Please send AL-RISALA to me/my friend/relative at the following address:

Name: ____________________

Address: ____________________

____

____

Please send a free sample copy of AL-RISALA at the following address:

____

____

____

(Please use a separate sheet for more than one address)

☐ Please send a publications catalogue

Please tick box where applicable

☐ Urdu ☐ 1 year ☐ 3 years
☐ English ☐ 2 years ☐ 5 years
☐ Air-mail ☐ Surface-mail

I am enclosing Cheques/Bank Draft/Postal Order/M.O. Receipt No. ________

Subscription Rates

INLAND	ABROAD AIRMAIL	ABROAD SURFACE MAIL
1 year Rs 60	Rs 400/$25/£15	Rs 200/$15/£8
2 years Rs 110	Rs 700/$45/£25	Rs 350/$25/£15
3 years Rs 150	Rs 1000/$65/£40	Rs 500/$35/£20
5 years Rs 240	Rs 1500/$100/£60	Rs 750/$55/£30

Pakistan Rs 150 for one year

Supporting Subscription (For One Year)

INLAND .... Rs 300
ABROAD (By Air-mail) .... $100/£60

Please send this together with the payment to the Circulation Manager.
AL-RISALA, The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No D(SE) 243 □ RNI 28822/76 □ February 1990 No 159 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs				
تذکیر القرآن جلد اول	125/-	تبلیغی تحریک	15/-	زلزلۂ قیامت	6/-
〃 جلد دوم	125/-	میوات کا سفر	30/-	حقیقت کی تلاش	4/-
اللہ اکبر	40/-	اقوال حکمت	15/-	پیغمبر اسلام	4/-
پیغمبر انقلاب	30/-	تعبیر کی غلطی	40/-	آخری سفر	5/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-	دین کی سیاسی تعبیر	12/-	اسلامی دعوت	5/-
عظمتِ قرآن	25/-	دین کیا ہے	3/-	خدا اور انسان	5/-
دین کامل	40/-	قرآن کا مطلوب انسان	7/-	حل یہاں ہے	6/-
الاسلام	30/-	تجدیدِ دین		سچا راستہ	3/-
ظہورِ اسلام	30/-	اسلام دینِ فطرت	5/-	دینی تعلیم	5/-
اسلامی زندگی	25/-	تعمیرِ ملت	5/-	حیاتِ طیبہ	4/-
احیاءِ اسلام	20/-	تاریخ کا سبق	5/-	باغِ جنت	5/-
رازِ حیات (مجلد)	50/-	مذہب اور سائنس	8/-	نارِ جہنم	5/-
صراطِ مستقیم	30/-	عقلیاتِ اسلام	5/-		
خاتونِ اسلام	35/-	فسادات کا مسئلہ	4/-		
سوشلزم اور اسلام	30/-	انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-		
اسلام اور عصرِ حاضر	25/-	تعارفِ اسلام	4/-		
حقیقتِ حج	25/-	اسلام پندرھویں صدی میں	4/-		
اسلامی تعلیمات	25/-	راہیں بند نہیں	5/-		
اسلام دورِ جدید کا خالق	15/-	ایمانی طاقت	5/-		
رشدیات		اتحادِ ملت	5/-		
تعمیر کی طرف	6/-	سبق آموز واقعات	5/-		

God Arises	Rs. 55/-
Muhammad The Prophet of Revolution	60/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳